Pdf by Aswad Raza

رنگِ حیات

انوار علیگی

زندگی کے اَن گنت رنگ ہیں، کچھ گہرے، کچھ ہلکے، کچھ اتنے پھیکے کہ نظر جا کر دیکھنے پر بھی دکھائی نہیں دیتے۔ بس ایک احساس ہوتا ہے انہیں دیکھ کر کہ یہ بھی شاید زندگی ہی کا کوئی رنگ ہے۔ بے شمار رنگ ایسے ہیں جن کے نام رکھ دیے گئے ہیں اور بہت سے ابھی اپنی شناخت سے محروم ہیں۔ کچھ اتنے شوخ، اتنے پُرکشش ہیں کہ اُن پر نظریں جم کر رہ جاتی ہیں اور جو اُن سے محروم ہیں بے اختیار اُن کے دلوں میں خواہشیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں کہ کاش ہم بھی۔۔۔ رنگ و نور کی اس دُنیا میں ہر شخص ایک آسودہ اور رنگا رنگ زندگی کا خواہاں ہے لیکن یہ تو قدرت کی کرشمہ کاری ہے۔ انسان تو بس خواہش اور زیادہ سے زیادہ کوشش ہی کر سکتا ہے۔

ایک ذہین مگر نا آسودہ بچے کی کہانی، ایک احسان کی چمک میں پھلوالی اداکارہ کا افسانہ۔ اس ماہ کے لیے [illegible]

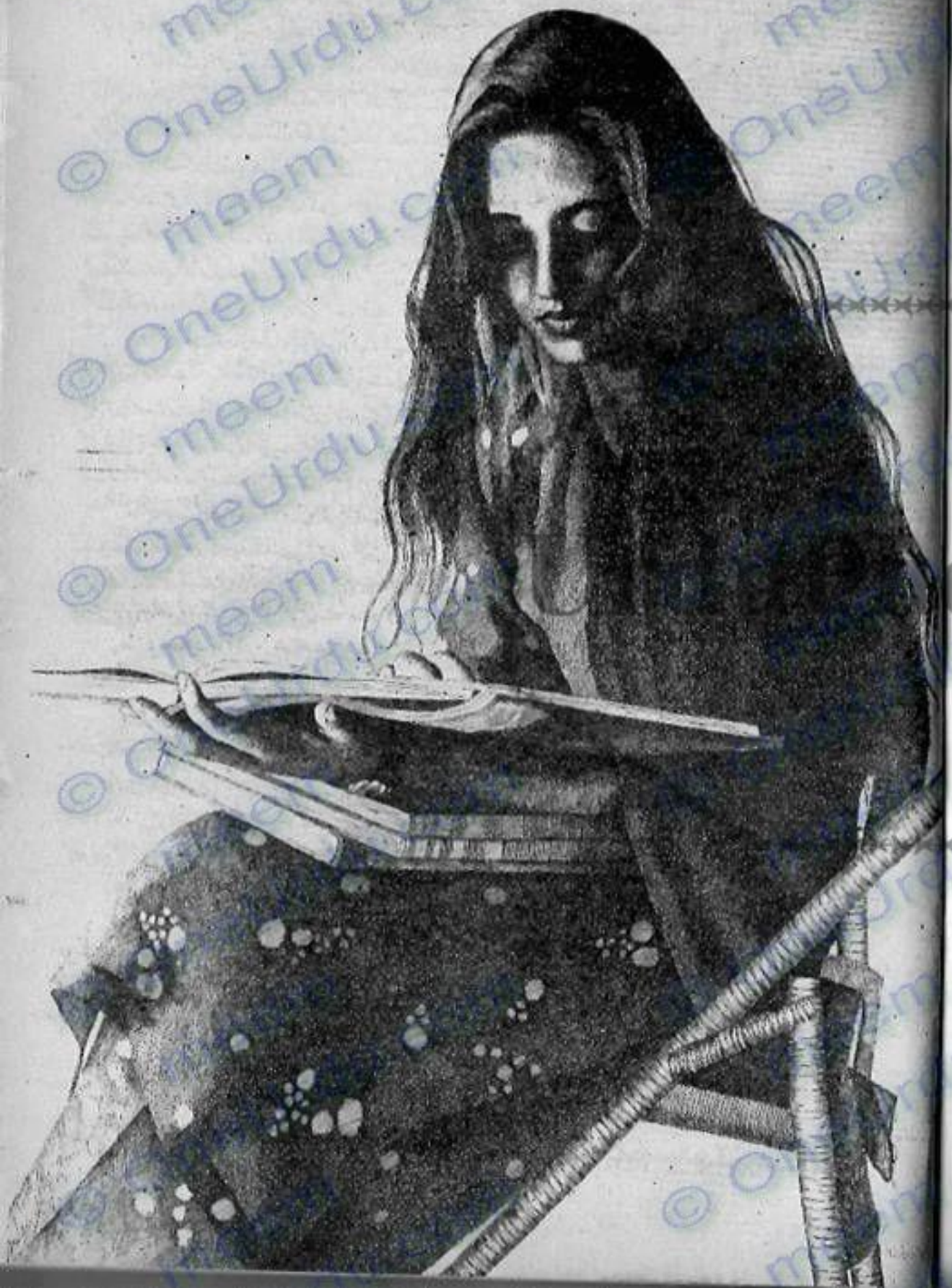

Pdf by Aswad Raza

وه

جہاں پیدا ہوا، وہاں غربت ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ اس بات پر وہ کل شرمندہ تھا اور نہ آج شرمندہ ہے۔ اس کا باپ مزدور تھا۔ وہ تعمیری کام کرتا تھا۔ جانے اس نے کتنے مکان اور کتنی عمارتیں تعمیر کر دی تھیں لیکن وہ اپنے گھر کی کچی دیوار کو پختہ نہ کروا سکا تھا۔

اس گھر میں اس کے باپ کا باپ بھی رہتا تھا۔ وہ بھی مزدور تھا۔ وہ دونوں مل کر کماتے تھے اور وہ شام کو ان کے آنے کی راہ دیکھا کرتا تھا۔ اسے اپنے باپ کے مقابلے میں دادا سے زیادہ محبت تھی۔ وہ ہر وقت ان سے چپکا رہتا تھا۔ اس کے دادا کو بھی اس سے بہت محبت تھی، گویا ان کی جان تھی اس میں۔ وہ گھر میں آتے تو اس کے لیے مٹھائی کی ایک گولی ضرور لاتے۔ اپنے ساتھ کھانا کھلاتے، اسے کندھے پر بٹھا کر گلی کی سیر کراتے۔ گھر کے آنگن میں اس کے لیے گھوڑا بنتے اور وہ ان کی پیٹھ پر سوار ہو کر بڑا خوش ہوتا۔

وہ اس وقت ڈھائی سال کا تھا جب اس کا باپ ایک عمارت پر کام کرتے ہوئے اوپر سے گرا۔ وہ مسالے کی پرات لے کر لکڑی کی سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ پاؤں پھسلا اور وہ مع پرات نیچے آ رہا۔ بہ ظاہر کہیں کوئی چوٹ نہ لگی۔ وہ اٹھا، کپڑے جھاڑے اور پھر سے کام پر لگ گیا۔ شام تک وہ پورے اطمینان سے کام کرتا رہا۔

شام کو جب ٹھیکے دار نے اس کے ہاتھ پر مزدوری رکھی تو اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ آج آخری مزدوری لے رہا ہے۔ ٹھیکے دار کو کسی نے اس کے گرنے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس نے اسے مزدوری دیتے ہوئے پوچھا "فضل دین! آج تم گر گئے تھے؟"

"بس جی! ہم غریبوں کی قسمت میں گرنا ہی لکھا ہے، سو گرتے رہتے ہیں۔"

"چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں جی، اوپر والے نے کرم کر دیا۔ سر کے بل گرا پھر بھی بچ گیا۔"

"کہاں دھیان تھا تمہارا، کیسے گر گئے؟"

"غریب کو تو پیٹ کی آگ ہی چین نہیں لینے دیتی، اس کا دھیان کہاں ہو گا بھلا؟"

"فضل دین! تم کچھ پڑھے لکھے ہو؟"

"کہاں جی! میں تو پکا ان پڑھ ہوں، ہاں میرا باپ خدا بخش پانچ جماعتیں ضرور پاس ہے۔ اس نے مجھے بھی پڑھانے کی کوشش کی، لیکن میں پڑھ ہی نہ سکا۔ اب میں اپنے بیٹے خورشید کو ضرور پڑھاؤں گا لیکن آپ نے یہ کیوں پوچھا جی؟"

"تم باتیں بہت بڑھیا کرتے ہو اس لیے۔"

"ہاں میرے باپ خدا بخش کا بھی یہی خیال ہے کہ میں باتیں بہت بناتا ہوں، کام کم کرتا ہوں۔ میری بیوی کہتی ہے کہ میں بڑی کڑوی باتیں کرتا ہوں لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ میں سچی باتیں کرتا ہوں، پھر کڑوی میٹھی جیسی بھی ہیں اور کچھ کو کڑوی۔"

"اچھا، اچھا اب زیادہ تقریر جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ گھر جا کر تھوڑا سا دودھ ضرور پی لینا، پھٹکری ڈال کر۔ اگر کوئی اندرونی چوٹ لگی ہو گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ٹھیکے دار جی! آپ بھی کمال کرتے ہیں، ہم غریبوں کو پینے کے لیے صاف پانی تو ملتا نہیں، دودھ بھلا کہاں سے ملے گا۔ ویسے مجھے کچھ نہیں ہوا، میں بھلا چنگا ہوں۔"

"اچھا، ٹھیک ہے کل ذرا جلدی آنا۔"

لیکن پھر وہ کل کبھی نہ آئی۔

فضل دین گھر پہنچا تو اس کا باپ خدا بخش موجود نہ تھا۔ آج کل وہ ایک اینٹوں کے بھٹے پر کام کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا خورشید دروازے پر کھڑا اپنے دادا کا انتظار کر رہا تھا۔ آج فضل دین نے اس کے لیے مٹھائی کی گولی خریدی تھی۔ دادا کی جگہ آج باپ کو پہلے آتے دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ جب فضل دین نے اسے گولی دی تو اسے لگا جیسے باپ آج دادا بن گیا ہے۔ فضل دین نے اسے اٹھا کر پیار کیا اور گود میں لیے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی بیوی صابرہ صحن میں ٹوٹی چارپائی پر بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ اس نے خورشید اور فضل دین کی ملی جلی آوازوں پر سر اٹھایا۔

"اماں، ابا گولی لایا۔" خورشید نے اپنی ماں کو خوش ہو کر مٹھی میں بھنچی گولی دکھائی۔

"اچھا آج اسے گولی کا خیال کیسے آ گیا؟ شاید آج کچھ زیادہ ہی خوش ہو کر آیا ہے۔"

"اری بھاگوان! ہمارے نصیبوں میں خوشی کہاں۔" فضل دین نے خورشید کو گود سے اتارتے ہوئے کہا۔ "آج میں خوش ہو کر نہیں، گر کر آ رہا ہوں۔"

"ہائے ربا!" صابرہ نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ "کیا ہوا؟ تُو کیسے گرا؟ تجھے کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"مسالے کی پرات لے کر سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ پاؤں غلط جگہ پڑا اور میں نیچے آ رہا۔ یہ اچھا ہوا کہ زیادہ اونچائی سے نہیں گرا اور سر کے بل گرنے کے باوجود کوئی چوٹ نہیں آئی۔ اب کچھ سر میں دکھن سی ہو رہی ہے۔" فضل دین نے اپنا سر دبایا۔

"لا میں تیرے سر میں مالش کر دوں۔"

"اری رہنے دے، مجھے بھوک لگ رہی ہے، کچھ کھانے کو دے۔"

"کھانے کو تو گھر میں کچھ نہیں اور یہ تجھے بے وقت بھوک کیسے لگ گئی؟ میں تو ابھی کھانا پکا رہی ہوں۔"

"اچھا، تُو کھانا پکا، مجھے ایک پیالہ چائے بنا دے، میں دکان سے دہی لے کر آتا ہوں۔"

پھر اس نے خورشید کو اپنے ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ آج بڑا خوش تھا۔ آج تو اس کے عیش ہو گئے تھے۔ اس کے باپ نے آج نہ صرف اسے گولی لا کر دی تھی بلکہ وہ اپنے باپ کی گود میں بازار بھی جا رہا تھا۔ خورشید بہ آسانی چل سکتا تھا لیکن اس نے آج اپنے بیٹے کو گود میں اٹھایا تھا بلکہ اسے سینے سے چپٹائے ہوئے تھا اور اس کے رخساروں پر بار بار پیار کر رہا تھا۔

دہی خرید کر جب فضل دین گھر پہنچا تو صابرہ چولہے سے چائے کی دیگچی اتار چکی تھی۔ دونوں باپ بیٹوں نے مل کر چائے میں بھگو بھگو کر خوب دہی کھائی۔ ایک دو دفعہ فضل دین نے اپنی بیوی کو بھی دینے کی کوشش کی لیکن اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ وہ بس گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پیتی رہی۔

دن ڈھلے خدا بخش گھر میں داخل ہوا۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا تھا۔ خورشید اسے دیکھتے ہی لپکا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ "دادا، دادا! آج ابا میرے لیے گولی لایا۔"

"چلو یہ اچھا ہوا۔" خدا بخش نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ "آج میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھے آج پیسے نہیں ملے۔ میں نے آتی دیر بٹ صاحب کا انتظار بھی کیا لیکن وہ آئے نہیں۔ اب کل پیسے ملیں گے۔"

"دادا، دادا! آج ہم نے دہی کھائی۔"

"واہ بھئی واہ! آج تو ہمارے بیٹے کی عید ہو گئی۔"

"دادا! میں نے تمہارے لیے آدھا دہی رکھا ہوا ہے، ابھی لاتا ہوں۔"

فضل دین اور صابرہ دونوں اپنے بیٹے خورشید کو دیکھنے لگے۔ انہیں بڑی حیرت تھی۔ جانے کس وقت اس نے اپنے دادا کے لیے دہی بچایا اور چھپا کر کہیں رکھ بھی دیا۔

خورشید بھاگ کر اندر کمرے میں گیا۔ دروازے کے نیچے رکھا ہوا دہی نکالا اور دادا کے ہاتھ پر لا رکھا۔

"لو دادا! کھاؤ۔" خدا بخش اپنے پوتے کی اس محبت پر باغ باغ ہو اٹھا۔ اس نے اسے اٹھا کر کلیجے سے لگایا۔ "میرا بیٹا۔"

"دادا، دادا! آج ابا گر گیا۔" خورشید نے خبر سنائی۔

"ارے کیوں فضل دین! کیا ہوا؟" خدا بخش، فضل دین سے مخاطب ہوا اور اس کے برابر ہی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ صابرہ صحن کے ایک کونے میں بنے مٹی کے چولہے پر مونگ کی دال کی کھچڑی پکا رہی تھی۔

"ہاں ابا! میں گرا ضرور تھا پر اللہ کا فضل ہو گیا، چوٹ بالکل نہیں لگی۔"

لیکن یہ محض اس کا خیال تھا کہ اسے کوئی چوٹ نہیں لگی۔ کھانا کھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا لیکن کیونکہ گھر میں پہلے ہی اندھیرا تھا اس لیے اسے آنکھوں کے سامنے پھیلتے اندھیرے کا زیادہ احساس نہ ہوا۔ اسے نیند سی آنے لگی اور وہ صحن میں پڑی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے لیٹ کر خراٹے بھرنے لگا۔

صبح اذانوں کے وقت حسب معمول خدا بخش کی آنکھ کھلی۔ ہر سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ خدا بخش اپنے بیٹے فضل دین کو جو چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر سو رہا تھا، دیکھتا ہوا گھر سے نکل گیا۔

قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ وہاں خدا بخش نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد وہ مولوی کے پاس کچھ دیر بیٹھا۔ مولوی فرزند علی سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ دونوں نے کچھ دیر گپ شپ کی۔ اب اچھا خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ خدا بخش نے پھر گھر کی راہ لی۔ اسے معلوم تھا کہ خورشید اب تک جاگ چکا ہو گا اور چائے کا پیالہ اپنے سامنے رکھے اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔

خدا بخش جب گلی میں پہنچا تو اسے رونے کی کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ یہ آواز اس کے گھر سے آ رہی ہے اور صابرہ کی ہے۔ ساتھ میں خورشید کے چیخنے کی بھی آوازیں تھیں "ابا... ابا..."

خدا بخش نے دوڑ لگائی۔ جب گھر میں قدم رکھا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ صابرہ چارپائی کی پٹی پر اپنا سر مار مار کر رو رہی تھی۔ خورشید اس کی ٹانگوں سے لپٹا تھا اور فضل دین پورے اطمینان سے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے، اس کی بیوی کیا کر رہی ہے اور بیٹا پاؤں سے لپٹا کیوں رو رہا ہے۔

فضل دین کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ناک سے خون بہہ کر جم گیا تھا۔

خدا بخش نے اپنے بیٹے کی کھلی آنکھوں کو بند کیا اور اس کی لاش کو ایک پھٹے ہوئے کھیس سے ڈھک دیا۔

پھر اس نے اپنی بہو صابرہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور روتے ہوئے کہا "صبر کر۔" صابرہ یہ سن کر اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

تب خدا بخش نے اپنے پوتے خورشید کو گود میں اٹھایا اور اسے اپنے سینے سے لگا کر پیار کرتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ سیدھا مسجد پہنچا۔ وہاں اس نے اپنے بیٹے فضل دین کی موت کی اطلاع دی اور یہ بھی بتایا "مولوی جی! میں خالی ہاتھ ہوں۔"

"خدا بخش تم فکر نہ کرو، اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" مولوی فرزند نے خدا بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

پھر یہی ہوا۔ اللہ نے ساتھ دیا، اہل بستی نے ساتھ دیا اور فضل دین عصر تک قبر کے حوالے کر دیا گیا۔

خورشید ڈھائی سال کا تھا جب اس کا باپ مرا۔ اس کے پورے پانچ سال بعد اس کی ماں کا بلاوا آیا۔ جب اس کی ماں مری تو وہ ساڑھے سات سال کا تھا اور اب اسے اپنے باپ کا چہرہ یاد نہ رہا تھا۔

Pdf by Aswad Raza

یاد تو وہ خیر اپنی ماں کا چہرہ بھی نہیں سکتا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس نے اپنی ماں کے چہرے پر اتنے دکھ دیکھے تھے کہ وہ تڑپ اٹھتا تھا۔ اس کم عمری میں اس کے ذہن نے بعض معاملات میں بڑی پختگی اختیار کر لی تھی۔ وہ دکھوں سے خوب آشنا ہو گیا تھا۔

اپنی ماں کا چہرہ وہ زندگی بھر نہ بھول پایا۔

فضل دین کی بے وقت موت نے خدا بخش کو نڈھال کر دیا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ جوان بیٹے کا دکھ اوپر سے جوان بہو کی ذمے داری۔ پوتے کی نگرانی۔ وہ بوڑھا تھا لیکن اتنا بوڑھا نہ تھا کہ کام سے ہاتھ کھینچ کر گھر بیٹھ جاتا۔ وہ مزید محنت کرنے کے لیے تیار تھا لیکن ان نئے دکھوں سے نمٹنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ خاص طور سے وہ صابرہ کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔

ایک دن شام کو اس نے صابرہ سے اس مسئلے پر بات کی۔

”صابرہ! میں چاہتا ہوں کہ تیری شادی کر دوں۔“

”ابا! تم پہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھی۔ ایک دم گھبرا گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔

”دیکھ بیٹی! ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تجھے پہاڑ سی زندگی گزارنا ہے اور یہ پہاڑ سی زندگی بغیر کسی مرد کے گزارنا ممکن نہیں۔“

”نہیں ابا! میں شادی کے بغیر ٹھیک ہوں۔ میں گزارا کر لوں گی۔ مجھے بس تمہارا سہارا چاہیے۔ تمہارا سایہ چاہیے۔ میں اس گھر کا آنگن کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گی۔“

”دیکھ صابرہ! میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں تیری حفاظت نہیں کر سکتا۔ تُو ابھی زمانے سے واقف نہیں۔ یہ دنیا برائی کی تلاش میں رہتی ہے اگر اسے بندے میں تلاش کے باوجود کوئی برائی نہ ملے تو خود تخلیق کر لیتی ہے۔ ایک جوان عورت کا گھر میں تنہا رہنا کوئی مسئلہ نہیں۔ عورت چاہے تو تنہا رہ سکتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ دنیا والے اسے تنہا رہنے نہیں دیتے۔ ایسے ایسے الزام لگاتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کو جی چاہتا ہے۔ دیکھ صابرہ! اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، کمزور ہو گیا ہوں۔ میں تیری حفاظت نہیں کر سکتا۔ اب میں تیری نگرانی کروں گا تو روزی کما کر کون لائے گا۔“ خدا بخش نے اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہاں تو ابا! یوں کہو نا کہ میں تم پر بوجھ بن گئی ہوں اور تم اس بوجھ کو دوسرے کے کندھے پر ڈال کر فارغ ہو جانا چاہتے ہو۔“ صابرہ نے خدا بخش کے دل پر تیر چلا دیا۔

”خدا گواہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ رزق دینے والا تو وہ ہے۔ مجھے اس کی بالکل پروا نہیں۔ تُو مجھ پر بوجھ نہیں ہے۔ میں یہ بات تیرے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ تیرے بچے ہی کوئی ہوتا تو میں دو دن تجھے چھوڑ دیتا لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے سوا اب اس دنیا میں تیرا کوئی اور نہیں اس لیے میرا فرض ہے کہ میں تیرے لیے اچھا سوچوں۔ تیرے دکھوں کا مداوا کروں۔ تُو ابھی کم عمر ہے۔ تُو وہ باتیں نہیں جانتی جو میں جانتا ہوں۔“

”تم کچھ نہیں جانتے ابا! تم بس اتنا جانتے ہو کہ میں اس گھر سے چلی جاؤں۔ تو یہ بات اب تم کان کھول کر سن لو۔ میں اس گھر سے کبھی نہیں جاؤں گی۔ تمہارے پاس رہوں گی۔ تمہاری خدمت کروں گی۔“

یہ کہہ کر وہ خدا بخش کے قدموں میں جھکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب خدا بخش نے اسے اپنے قدموں سے اٹھایا۔ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”اچھا درست۔ اپنا جی ہلکان نہ کر۔ اللہ پر بھروسا رکھ جو کچھ ہو گا بہتر ہی ہو گا۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔“

لیکن راہ کوئی نہ نکلی۔ جا بجا راہ نکلتی۔ صابرہ کی شادی کے سوا مسئلے کا کوئی اور حل نہ تھا۔ خدا بخش چپکے چپکے اس مشن پر کام کرتا رہا۔ بالآخر وہ کامیاب ہو گیا۔

خدا بخش کے دور پرے کے رشتے دار تھے جو شیخوپورے میں رہتے تھے۔ ان کا ایک لڑکا کراچی میں تھا جو وہاں کوئی کاروبار کر رہا تھا۔ وہ کراچی سے آیا ہوا تھا اور وہ آنا دوبارہ آیا تو خدا بخش سے ملنے بھی چلا آیا۔ اس گھر میں صابرہ پر نظر پڑی تو اس کے دل میں بجلیاں سی چمکنے لگیں پھر اس نے ایسی لچھے دار گفتگو کی کہ خدا بخش متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لڑکا برادری کا تھا۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک تھا اس لیے خدا بخش نے فیصلہ کر لیا کہ وہ صابرہ کا ہاتھ قربان کو پکڑا دے گا۔ خورشید کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس کے بارے میں اس نے طے کر لیا تھا کہ اگر اس کا ہونے والا شوہر خورشید کو رکھنے پر رضا مند بھی ہو گا تو بھی وہ اسے صابرہ کے ساتھ نہیں بھیجے گا۔ قربان سے جب بات ہوئی تو اس نے خورشید کو صابرہ کے ساتھ رکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ خدا بخش کو کوئی ملال نہ ہوا۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی نشانی کو اپنے سے الگ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جب خدا بخش نے صابرہ سے شادی کا ذکر کیا تو وہ حسبِ معمول پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی لیکن خدا بخش اس مرتبہ اس کے آنسوؤں سے متاثر نہ ہوا۔ اس نے زبردستی اسے قربان کے ساتھ رخصت کر دیا۔

قربان، صابرہ کو کراچی لے آیا۔ لیاری میں اس کے پاس ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان تھا۔ بجلی تھی۔ گلی میں پانی کا نلکا لگا ہوا تھا۔ گھر میں مٹی کے تیل کا چولہا تھا۔ صابرہ نے لاہور میں کچا مکان دیکھا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں زندگی کے اندھیرے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ مٹی سے بنے چولہے میں گیلی لکڑیاں اپنی پھونکوں سے سلگا کر جلاتی تھی۔ پانی کے لیے بوند بوند ترسی تھی۔ کراچی میں اس لحاظ سے بہت سہولتیں میسر تھیں۔

قربان نے دس پندرہ دن اسے خوب کراچی کی سیر کروائی۔ اس سے خوب محبت بھری باتیں کیں۔ اس کی خوب دلجوئی کی۔ اس طرح وہ قربان کو پا کر سب کچھ بھول گئی۔ اسے اپنا ماضی جیسا ایک خواب کی طرح محسوس ہونے لگا۔ وہ خدا بخش کو اٹھتے بیٹھتے دعائیں دینے لگی۔ اس فرشتہ صفت انسان نے اسے جیتے جی جنت میں بھیج دیا تھا۔ کبھی کبھی اسے خورشید یاد آتا تھا لیکن اتنا نہیں کہ وہ تڑپ اٹھتی۔ اب اس کی ساری تڑپ قربان کے لیے تھی۔ باقی وہ سب کچھ بھولتی جا رہی تھی۔

صابرہ کو نہیں معلوم تھا کہ قربان کیا کام کرتا ہے لیکن وہ جو بھی کام کرتا تھا، اچھا ہی کرتا تھا کیونکہ گھر میں پیسے کی تنگی نہ تھی۔ فضل دین کے گھر میں کبھی اسے من پسند کھانا نہیں ملا تھا لیکن قربان کے گھر میں اس نے شروع ہی سے من پسند کھانا کھایا تھا۔ ریشمیں کپڑا پہنا تھا۔ خوب تفریح کی تھی۔ ڈھیر ساری فلمیں دیکھی تھیں۔

ایک دن قربان اسے انگلش فلم دکھانے لے گیا۔ فلم تو اس کی خاک سمجھ میں نہ آئی لیکن اس کے کچھ مناظر دیکھ کر وہ بڑی شرمائی۔ قربان ہنستا رہا اور وہ توبہ کرتی رہی کہ آج تو وہ آ گئی۔ انگلش فلم دیکھنے آئندہ کبھی نہیں آئے گی لیکن قربان نے تو آج اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی ابتدا کی تھی۔

پھر وہ دھیرے دھیرے اس کے سامنے ظاہر ہوتا گیا۔ اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ قربان کا اصل کاروبار کیا ہے۔ قربان اپنے دوستوں کو لانے لگا۔ تب اسے معلوم ہوا کہ قربان کا اصل روپ کیا ہے۔ ان محبتوں کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔ وہ ایک زہریلا انسان تھا اور اس زہر کو صابرہ کی روح میں اتار دینا چاہتا تھا۔

تب صابرہ کو وہ کچا مکان یاد آنے لگا۔ لالٹین کی روشنی اجالا بن کر چمکنے لگی۔ روکھی سوکھی روٹی ان تر نوالوں سے بہتر نظر آنے لگی۔ موٹے کپڑے کی سختی اس ریشمی کپڑے کی ملائمت سے زیادہ آرام دہ محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنے خوابوں میں خدا بخش کو دیکھنے لگی۔ اسے خورشید اپنے پاس محسوس ہونے لگا۔ اس کے دل میں خوف اترنے لگا۔ وہ ڈری ڈری سی رہنے لگی۔

قربان دھیرے دھیرے اس کے گرد گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔ وہ اسے اپنی راہ پر لگانا چاہتا تھا۔

”قربان! تم کیا چاہتے ہو؟“ ایک دن صابرہ نے تنگ آ کر زبان کھولی۔

”جو میں کہتا ہوں، کرتی جاؤ، خوش رہو گی۔“

”میں جانتی ہوں تم کیا چاہتے ہو لیکن تم جو چاہتے ہو وہ ہو نہ سکے گا۔“

”مجھے بندے کو اپنے ڈھب پر لانا بھی آتا ہے۔ یہ یاد رکھو۔“

”میں مر جاؤں گی لیکن تمہاری بتائی ہوئی راہ پر نہیں چلوں گی۔ تم آزما کر دیکھ لو۔“

”نقصان اٹھاؤ گی۔ ضد کرنے سے بہتر ہو گا سیدھی راہ پر آ جاؤ۔“

”اے تم سیدھی راہ کہتے ہو۔ گناہ کا راستہ بھی کبھی سیدھا ہوتا ہے؟“

”پھر تم خرافات سے باز نہ آؤ گی۔ لگتا ہے تمہارے ساتھ ٹیڑھا چلنا پڑے گا۔“

”قربان! تم نے مجھ سے شادی کی ہے تو مجھے عزت بھی دو۔“

”اچھا کھاؤ گی۔ اچھا پہنو گی۔ عیش سے رہو گی اور تمہیں کیا چاہیے۔“

”مجھے صرف عزت کی زندگی چاہیے۔ وہ تم اگر نہیں دے سکتے تو مجھے لاہور چھوڑ آؤ۔“

”لاہور!“ قربان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاں، تمہیں لاہور ضرور چھوڑ آؤں گا لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا تو میں ایک دن کی بھی دیر نہیں کروں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

اور یہ وعدہ بڑا سچا تھا۔ قربان نے وقت آنے پر اسے لاہور پہنچانے میں ایک دن کی بھی دیر نہ کی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ دن پانچ سال کے بعد آیا۔

صابرہ بری راہ پر چلنے سے مسلسل انکار کرتی رہی اور قربان اس مسلسل انکار کو اقرار میں بدلنے کی ہر ممکن سعی کرتا رہا۔ صابرہ ایک زخمی پرندہ تھی۔ اڑنے سے معذور اور بے بس۔ وہ کب تک انکار کرتی۔ بالآخر وہ اس راہ پر چل پڑی۔

آرزوؤں کے کانٹے جسم پر سجائے، آنکھوں میں پتھر خواب لیے اپنے دلفریب ہونٹ سیے، صابرہ وہ کچھ کرتی رہی جو قربان چاہتا تھا۔ اس کی فرمانبرداری نے قربان کو بہت خوش کر دیا تھا لیکن وہ جیتے جی بے حس ہو گئی تھی۔ پتھر بنتی جا رہی تھی۔ وہ سب کچھ دیکھتی رہتی۔ سب کچھ سنتی رہتی۔ پھر بھی سنتی رہتی۔ اس کی روح پر گناہ کی زندگی کے داغ پڑ گئے تھے۔

پانچ سال میں صابرہ بالکل کھوکھلی ہو کر رہ گئی۔ اسے مسلسل کھانسی اور بخار رہنے لگا۔ کچھ دنوں بعد وہ خون تھوکنے لگی اور جس دن اس نے خون تھوکا، یہ قربان کے گھر میں اس کا آخری دن ثابت ہوا۔ اب وہ وقت آ گیا تھا جس کا قربان نے صابرہ سے وعدہ کیا تھا۔

”چل صابرہ! اب واپس چلیں۔“

”ہاں، اب تو واپس ہی جانا ہے۔“ صابرہ نے انگشتِ شہادت اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اُدھر اوپر۔“

”ارے نہیں پگلی! لاہور، چل لاہور۔“

”لاہور میں اب میرا کیا رکھا ہے؟“

”کیوں نہیں، رکھا ہے۔ وہاں تیرا سابقہ سسر خدا بخش ہے، تیرا بیٹا خورشید ہے۔“

”جب تک اس میری پٹڑی میں جان تھی، تب تک میں پیاری رہی۔ اب میں خون تھوکنے لگی ہوں تو تو مجھے واپس اس کچے مکان میں پھینک آنا چاہتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ ابا زندہ بھی ہے یا مر گیا اور میرا بیٹا کہاں ہے۔ اسے میں نے ڈھائی سال کا چھوڑا تھا، جانے وہ کس حال میں ہو گا۔“

”یہ وہیں پہنچ کر معلوم ہو گا۔ مجھے امید ہے وہ بڈھا زندہ ہو گا۔“

جس طرح قربان نے اسے بُرے راستے پر ڈالا تھا بالکل اسی طرح اس نے اسے ذہن میں بٹھالا وہ خود ۔ ۔ ۔ ۔ نہ کرتی رہی لیکن اس کی کون سنتا۔ لاہور اسٹیشن پر قربان نے اسے تانگے میں بٹھا کر خود پشاور والوں کی راہ لی۔ اب اسے نئے شکار کی تلاش تھی۔ تانگے والے نے دو آنہ دربار کے پیچھے جو کچی آبادی تھی، وہاں صابرہ کو پہنچا دیا۔

صابرہ جب اپنے مرحوم شوہر فضل دین کے گھر کے دروازے پر پہنچی تو مغرب کا وقت تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ خدا بخش اور

خورشید چارپائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

جب گھر میں داخل ہوئی تو خدا بخش اُسے کوئی مانگنے والی سمجھا۔

وہ اسے دُھتکارتے ہوئے بولا "ہماری جان سے دروازے پر جاکر کھڑی ہو۔ یہ کیا طریقہ ہے کہ منہ اٹھائے چلی آ رہی ہے اندر۔ خورشید اسے ایک روٹی دے کر چلتا کرو۔"

خدا بخش کی بات سن کر اُس کے دل پر گھونسا سا لگا اور وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئی اور گلوگیر آواز میں بولی۔ "ابا آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں تمہاری بدنصیب بہو ہوں صابرہ۔"

یہ سن کر خدا بخش تڑپ اٹھا۔ اُس کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر رکابی میں جا گرا۔

"یہ تو ہے صابرہ تو۔" خدا بخش کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "ارے خورشید دیکھ تیری ماں آئی ہے۔"

ماں کا نام سن کر خورشید نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اُس نے جلدی سے اٹھ کر اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے چارپائی پر بٹھایا۔

"معاف کرنا بہو میں اندھیرے کی وجہ سے تمہیں پہچان نہیں سکا۔"

"ابا مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں تم نے کم از کم بھکارن کہہ کر بعد میں اپنی بہو مان لیا اور نہ لوگ تو گھر سے رانی بنا کر سنبھالتے ہیں اور پھر دروازے پر بھکارن بنا کر چھوڑ جاتے ہیں۔"

"قربان کہاں ہے؟"

"ابا اس کا نام مت لو میرے سامنے۔ تم سے کتنا منع کیا تھا میں نے کہ مت کرو میری شادی مجھے اپنے سائے میں رہنے دو لیکن تم نہیں مانے۔ کاش تم مان جاتے مجھے اپنی خدمت کرنے دیتے۔" وہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

خدا بخش نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اُسے تسلی دی کھانا کھلایا اور جب خورشید سو گیا تو خدا بخش نے پھر اس سے قربان کے بارے میں پوچھا۔

"بیٹی! مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔"

"ابا اس کے بارے میں تمہیں کیا بتاؤں میں کچھ نہیں بتا سکتی بس تم میری حالت دیکھ لو اور سمجھ لو۔"

"تیری حالت دیکھ کر تو میرا جی چاہ رہا ہے کہ اُسے زندہ نہ چھوڑوں۔"

"نہیں ابا وہ اسی قابل ہے کہ اُسے مار دیا جائے اُس نے مجھے چلتی پھرتی لاش بنا دیا۔"

"کیا وہ تجھ سے مزدوری کروا رہا تھا؟"

"کاش وہ مجھ سے مزدوری کروا لیتا لوگوں کے گھروں کے برتن دھلوا لیتا لیکن میری روح کو زخمی نہ کرتا۔ ابا میرے جسم اور روح پر اتنے زخم ہیں کہ بتا نہیں سکتی دکھا نہیں سکتی۔ بہرحال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں اپنوں میں پہنچ گئی اب سکون سے مر سکوں گی۔"

"نہیں صابرہ! تجھے مرنا نہیں ہے اپنے بیٹے خورشید کے لیے جینا ہے اس کی خوشیاں دیکھنا ہیں۔"

لیکن صابرہ کو بہت جلدی تھی جانے کی بڑی عجلت تھی۔ دس پندرہ دن میں چٹ پٹ ہو گئی۔ خورشید اپنی ماں کا چہرہ زندگی بھر نہ بھول سکا۔ اُس کے چہرے پر لکھی دکھ کی تحریر تھے جو زندگی بھر لو دیتے رہے۔ وہ اس عمر میں اپنی ماں کے دکھوں سے آشنا نہ ہو سکا لیکن جب ذرا بڑا ہوا تو زندگی کے سارے اسرار کھل گئے۔ آہستہ آہستہ اس کے دادا خدا بخش نے اُسے سب کچھ دیا سب کچھ بتا دیا۔

"خورشید یہ تیری بدنصیب ماں ہے تیرے باپ کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے کی خاطر اس کی دوسری شادی کر دی تھی۔ میں اس کی شادی کرکے جیسے مطمئن ہو گیا۔ میں یہ سمجھتا رہا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہوگی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اُسے دوزخ میں دھکیل دیا ہے۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ تجھے اس سے ملوا لاؤں لیکن ڈرتا رہا کہ کہیں تجھے دیکھ کر وہ بکھر نہ جائے اور اس کے ڈر سے تو پریشان نہ ہو جائے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ اُس کمینے نے اُسے کمائی کا ذریعہ بنایا ہے تو میں جا کر اُس کا قیمہ کر دیتا مگر اب کیا فائدہ۔ خورشید یہ سب میری غلطی سے ہوا عورت ایک بیل کی طرح ہوتی ہے اُسے جہاں چاہو چڑھا دو مضبوط سہارا ملے تو چلنے پھولنے لگتی ہے۔ میں نے اُسے شورہ لگی دیوار پر چڑھا دیا شورہ اس کی رگوں کو چاٹ گیا۔ ارے کیا میں اتنا بے وقوف ہوں کہ اچھے برے کی تمیز نہ کر سکا شاید میں اتنا ہی بے وقوف ہوں میں اندھا ہو گیا تھا میں نے ایک ظالم کے حوالے کر دیا کیا میں اسے دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھلا سکتا تھا۔ مجھ سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ تیری ماں میری حماقت کی بھینٹ چڑھ گئی۔"

خورشید خاموشی سے اپنے دادا کی باتیں سنتا رہتا۔ وہ کچھ سمجھتا اور کچھ نہ سمجھتا لیکن وہ خدا بخش سے پلٹ کر کوئی سوال نہ کرتا۔ اس کی ماں جس کے بارے میں اس نے دادا کی زبانی ہی سب کچھ سنا تھا وہ اس گھر کے آنگن میں خون تھوکتی چلی بسی تھی۔ خورشید اگر اُس کے قریب بھی جاتا تو وہ اُسے اپنے سے دور ہٹا دیتی۔ وہ کہتی۔ "خورشید میرے بچے میرے پاس نہ آ۔ تجھے بھی یہ موذی بیماری لگ جائے گی۔ جا باہر کھیل۔"

شروع کے ایک دو دن تو صابرہ پرسکون رہی۔ اُس نے اپنے بیٹے خورشید کو ممتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر اُسے خوب بھینچ بھینچ کر پیار کیا تھا پھر اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام اس نے خورشید کو دیکھ کر گزارے وہ اُسے اپنے قریب بھی نہ آنے دیتی اور اپنی آنکھوں سے اوجھل بھی نہ ہونے دیتی۔

خدا بخش نے لاکھ چاہا کہ وہ اُسے اسپتال لے جائے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ابا اب میرے ساتھ زبردستی نہ کر میں زیادہ نہیں جیوں گی مجھے میرے بیٹے کے ساتھ رہنے دے۔"

پھر خدا بخش نے محلے کے ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ اُس نے بتایا مرض بہت بڑھ چکا ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا اگر یہ اسپتال نہیں جاتی تو بس اللہ سے دعا کرو وہی زندگی اور موت کا مالک ہے۔"

صابرہ جتنی زندگی لکھا کر لائی تھی اُتنی سانسیں گزار کر آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔ اُس کی موت سے خدا بخش بہت متاثر ہوا اور وہ اُسے پچھتاوے میں مبتلا کر گئی تھی۔ وہ شام کو خورشید کو اپنے سامنے بٹھا لیتا، چلم پیتا جاتا اور بولتا جاتا۔

"دیکھ خورشید تیری ماں کو میں نے مار دیا۔ وہ کونپل جیسی نازک لڑکی میری بزدلی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اگر میں بیدار ہوتا تو اُسے میں گھر میں رہنے دیتا تو جوان ہوتا تو اس کا اور میرا سہارا بن جاتا۔ ہماری راضی ہو جاتا۔ ہم جو زندگی بھر تنور کی روٹی کھاتے رہے گھر کی پکی کھاتے۔ گھر میں عورت نہ ہو تو وہ سرائے ہوتا ہے۔ ہم نے خود اپنے گھر کو سرائے بنا لیا محض اس ڈر سے کہ اس عورت کو ہمارے پیچھے کوئی بہکا کر نہ لے جائے۔ میں بزدل تھا اس کی حفاظت نہ کر سکنے کے خوف سے اُسے دوسرے کے حوالے کر دیا اور پھر پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ خورشید تو ابھی میرے دکھ کو نہیں سمجھ سکے گا۔ اتنا دکھ تو مجھے اپنے بیٹے کی موت پر بھی نہیں ہوا تھا جتنا تیری ماں دے گئی۔"

کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ خورشید کو اپنے دادا کے دکھ کی شدت کا احساس تو نہ ہوتا لیکن وہ اُس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو فوراً دیکھ لیتا۔ وہ جھٹ سے اٹھتا، اپنے دادا کے قریب آتا اور اپنی قمیص کے دامن سے اس کے آنسو پونچھ کر کہتا۔ "دادا تم اتنے بڑے ہو کر روتے ہو، یہ کام تو بچوں کا ہے۔"

تب خدا بخش مسکرا اٹھتا۔ وہ اُسے اپنی باہوں میں بھینچ لیتا۔

"میرا بیٹا، میرا خورشید۔"

خدا بخش کو خورشید سے بہت محبت تھی تو خورشید بھی اپنے دادا کے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ خورشید اس کے بیٹے کی پہلی اور آخری نشانی تھا۔ اس میں اس کی جان تھی۔ صابرہ کے کراچی جانے کے بعد جب خورشید گھر میں اکیلا رہ گیا تو مسئلہ پیدا ہوا کہ اُسے کہاں چھوڑا جائے۔ خدا بخش کو تو مزدوری کے لیے بیٹھے پر جانا پڑتا تھا۔ وہ چاہتا تو اُسے بیٹھے پر لے جا سکتا تھا لیکن خدا بخش چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی زندگی سنور جائے وہ اُسے پڑھانا چاہتا تھا۔

تب اُس نے مولوی فرزند علی سے بات کی۔ "مولوی جی کیا کروں؟"

"کس بات کا؟"

"صابرہ تو اپنی سسرال چلی گئی۔ خورشید کو گھر میں اکیلا چھوڑا نہیں جا سکتا۔ بیٹھے پر میں لے جانا نہیں چاہتا۔ مولوی جی! میں اسے انسان بنانا چاہتا ہوں۔"

"تم ایسا کرو اسے میرے پاس چھوڑ دو۔ وہ دن بھر میرے ساتھ رہے گا، میں اُسے لکھنا پڑھنا سکھاؤں گا۔ اللہ رسولؐ کی باتیں بتاؤں گا۔ تم شام کو کام سے واپس آؤ تو اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ٹھیک ہے؟" مولوی فرزند علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ مولوی جی! آپ نے سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔" خدا بخش خوش ہو کر بولا۔

خدا بخش کا یہ روز کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ گھر سے نکلتے ہوئے خورشید کو مولوی فرزند علی کے گھر چھوڑ دیتا۔ مولوی فرزند علی اُسے اپنے ساتھ مسجد لے جاتے۔ مسجد میں اور بچے بھی آتے تھے۔ مولوی فرزند علی بچوں کو قرآن شریف پڑھاتے، دینی تعلیمات سے بہرہ ور کرتے، انہیں اچھی اچھی باتیں بتاتے۔ اس طرح ظہر تک یہ درس و تدریس کا سلسلہ چلتا۔ ظہر کی نماز کے بعد مولوی فرزند علی اپنے گھر چلے جاتے۔ خورشید ساتھ ہوتا۔ وہ دوپہر کا کھانا مولوی فرزند علی کے گھر والوں کے ساتھ کھاتا۔ کھانا کھا کر مولوی جی کچھ دیر آرام کرتے۔ خورشید ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتا۔ عصر کے وقت وہ پھر اسے اپنے ساتھ لے جاتے۔ عصر سے مغرب تک پھر مکتب لگتا۔ اس وقت نسبتاً بڑے بچے آتے جن کا قرآن شریف ختم ہونے کے قریب ہوتا یا وہ بچے جو قرآن شریف حفظ کرنا چاہتے۔

مغرب کے وقت خدا بخش مسجد میں پہنچ جاتا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر خورشید کو اپنے ساتھ لے آتا۔ راستے میں تنور سے روٹیاں خریدتا۔ سبزی یا دال لیتا۔ گھر آ کر ہنڈیا پکاتا۔ خورشید اس کے پاس بیٹھ کر دن بھر کی روداد سناتا۔ پھر وہ دونوں مل کر کھانا کھاتے۔ کھانے کے بعد خدا بخش چلم میں تمباکو بھر لیتا اور خورشید سے دنیا بھر کی باتیں کرتا۔ پھر رات کو سونے سے پہلے وہ خورشید سے قاعدہ سنتا۔ اُسے حرفوں کی پہچان کراتا۔ اُسے اچھی طرح سبق یاد کراتا۔ خورشید کا ذہن بہت اچھا تھا۔ اُسے پڑھنے سے دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پڑھنے کے معاملے میں اس نے کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ نہ مولوی فرزند علی کو اور نہ خدا بخش کو۔

اس طرح خورشید کا بچپن بہت اچھے ماحول میں گزر رہا۔ ایک طرف مولوی فرزند علی کی شفقت تھی۔ وہ اُسے اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ وہ تھا بھی ایسا ہی بھولا بھالا معصوم سا۔ اُسے دیکھ کر جانے کیوں خود بخود پیار اُمڈنے لگتا۔ اُستاد کی شفقت کے ساتھ اُسے دادا کی محبت بھی حاصل تھی پھر مولوی جی کے گھر والے بھی اُسے پسند کرتے تھے۔ وہ سب کی خدمت کرتا۔ سب کے کام کرتا اور سب کی دعائیں لیتا۔ بڑا ہوتا رہا۔

مولوی فرزند علی اس کی ذہانت اور فرمانبرداری سے بہت خوش تھے۔ وہ خدا بخش سے کہتے۔ "خدا بخش! تیرا پوتا بڑا ہونہار ہے، دیکھنا یہ ایک دن بہت ترقی کرے گا۔"

خدا بخش، مولوی فرزند علی سے اپنے بیٹے کی تعریف سن کر خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ وہ جواب دیتا۔ "مولوی جی! یہ سب تمہاری وجہ سے

Pdf by Aswad Raza

سے تمہاری شفقت اور محبت کی وجہ سے۔"

لیکن پھر اچانک خورشید کو مولوی فرزند علی کی شفقت اور محبت سے محروم ہونا پڑا۔

اُس دن مولوی فرزند علی فجر کی نماز پڑھانے مسجد نہ آئے۔ نماز تو خیر خدا بخش نے پڑھا دی لیکن وہ فکر مند ہو گیا کہ مولوی جی آج مسجد کیوں نہیں پہنچے۔ خدانخواستہ بیمار ہو گئے لیکن عشاء کی نماز تو انھوں نے پڑھائی تھی، بیماری کے کوئی آثار نہ تھے۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ مولوی فرزند علی کتنے ہی بیمار ہوتے، وہ نماز ضرور پڑھانے آتے تھے۔ خدا بخش نے انہیں تیز بخار میں بھی نماز پڑھاتے دیکھا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ دونوں مسجد کو تالا لگا کر ایک ساتھ ہی نکلے تھے۔ راستے میں مولوی فرزند علی نے اپنی بیٹی کی شادی کا ذکر کیا تھا۔ دس دن بعد اُن کی بڑی بیٹی مہرو کی شادی تھی۔ شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ رشتہ گھر کا ہی تھا۔ مولوی فرزند علی کے چھوٹے بھائی کا بیٹا۔ یہ لوگ قصور میں رہتے تھے۔ قصور میں اپنی زمینوں کے علاوہ مولوی فرزند کی زمینوں کی دیکھ بھال بھی اُن کے بھائی کے ذمے تھی۔ وہ ان زمینوں کی دیکھ بھال اپنی زمینوں کی طرح کرتے تھے اور فصلوں سے ہونے والی آمدنی پوری دیانت داری سے مولوی فرزند علی کو لاہور پہنچا جاتے تھے۔

مولوی فرزند کو اپنی آبائی زمینوں سے جو حاصل ہوتا، وہ اُن کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ تھا۔ مولوی فرزند بڑی اُفق تھے اور اپنے گھر میں اپنی ضرورت سے زیادہ مال نہ رکھتے۔ اس کچی آبادی کی چھوٹی مسجد کو بڑی حد تک انھوں نے اپنے پیسے سے تعمیر کروایا تھا۔ وہ اس بستی کی بڑی ہر دل عزیز شخصیت تھے۔

اور اسی پسندیدہ شخصیت کو کسی ناپسندیدہ شخص نے قتل کر دیا تھا۔

وہ کوئی چور تھا جو اُن کے گھر میں اُن کی بیٹی کا جہیز چرانے آیا تھا۔ جب وہ جوڑوں اور زیورات کا بکس اُٹھا کر جانے لگا تو مولوی فرزند کی چارپائی سے ٹکرایا۔ مولوی فرزند کی فوراً آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے چور کو اپنی گرفت میں لینا چاہا لیکن چور جوان تھا اور گرفت میں لینے والا بوڑھا۔ اس نے جھٹکا دے کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن جب مولوی فرزند جونک بن کر اس سے چمٹ گئے اور اس چور کو راہِ فرار مسدود اور چوری کا مال چھنتا ہوا نظر آیا تو وہ مشتعل ہو گیا۔ اس نے غصے سے مولوی فرزند علی کے سر پر سریے کا وار کیا۔ مولوی فرزند علی بے آواز زمین پر گرے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چور بکس لے بھاگا۔ بکس دوپہر کو بستی سے باہر جھاڑیوں میں پڑا مل گیا۔ یہ بکس خالی تھا۔

مولوی فرزند علی کی بیٹی کا جہیز چرانے والا شخص اب چور نہیں رہا تھا، قاتل ہو گیا تھا۔ اس قاتل کو پولیس نے بہت تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔

مولوی فرزند علی کو مسجد کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ یہ اُن کی وصیت تھی جو انھوں نے اپنی موت سے تین دن قبل کی تھی۔ اُن کے بھائی نے اپنی بھتیجی، اپنی ہونے والی بہو مہرو کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اپنی بھابی کو حوصلہ دیا، تسلی دی، دلاسا دیا اور کہا۔

"بھابی! تم کسی قسم کی فکر نہ کرنا۔ مہرو میری بیٹی ہے۔ زیورات اور قیمتی جوڑے چوری ہو گئے تو کیا ہوا۔ ہمیں جہیز نہیں مہرو چاہیے۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ مہرو سے چھوٹی شگفتہ کو بھی میرے چھوٹے کو دے دو۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ دونوں بیٹیاں میرے گھر کے آنگن میں آجائیں گی تو ان کے باپ کی زمینیں خود بہ خود میری ہو جائیں گی۔ میں کہتا ہوں سوچ لو اگر اس شہر میں یا تمہارے خاندان میں کوئی اچھا لڑکا ہو تو شگفتہ کو وہاں دے دینا۔ میں زمینوں کی دیکھ بھال جس طرح بھائی کی زندگی میں کرتا تھا، ویسے ہی کرتا رہوں گا۔ تم اگر چاہو تو لاہور چھوڑ دو۔ قصور چلو۔ تمہاری زمینیں اور تمہاری بیٹیاں تمہاری نگاہوں کے سامنے رہیں گی۔"

دیور کی اطمینان بھری باتیں سُن کر مولوی فرزند علی کی بیوہ رو پڑی۔ اُسے اپنے دیور سے انھی نیک جذبات کی توقع تھی۔ اُس نے اپنی دوسری بیٹی شگفتہ بھی اپنے دیور کو سونپ دی۔ مولوی فرزند علی کی صرف دو بیٹیاں ہی تھیں لیکن خود اُس نے اس کچی آبادی کو نہ چھوڑا۔ وہ اپنے شوہر کے پھیلائے ہوئے دینی کاموں میں لگ گئی۔ اُس نے گھر پر مکتب کھول لیا اور بچوں کو دینی تعلیمات سے آراستہ کرنے لگی۔ بیٹیاں بیاہنے کے بعد وہ گھر میں تنہا رہ گئی تھی۔ زمینوں سے جو کچھ آتا، وہ اس قناعت پسند خاتون کی ضرورتوں سے بہت زیادہ ہوتا۔ وہ اس رقم کو خدا بخش کے حوالے کر دیتی کہ مسجد کی تعمیر و توسیع کے لیے اُسے خرچ کیا جائے۔

مولوی فرزند علی کی موت کے بعد خورشید کو بڑا جذباتی دھچکا لگا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اُس نے کئی شفیق شخصیتوں کو اپنے سامنے سے اُٹھتے دیکھا تھا۔ پہلے اُس کے باپ نے اُسے اپنے سائے سے محروم کیا، پھر ماں نے اُسے خیر باد کہا۔ اب مولوی صاحب بھی اُسے خدا حافظ کہہ گئے تھے۔

مولوی فرزند علی خورشید کو بہت چاہتے تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ ان کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اُن کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد خورشید نے خود کو بڑا تنہا محسوس کیا۔

قرآن شریف پڑھنے کے بعد خورشید نے میونسپل کمیٹی کے اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس وقت وہ چوتھی جماعت میں تھا۔ اسکول سے واپسی پر وہ سیدھا مولوی فرزند علی کے گھر جاتا۔ وہاں دوپہر کا کھانا کھاتا۔ فرزند علی کی بیوہ کا اگر کوئی کام ہوتا تو خوشی خوشی اُسے انجام دیتا۔ کاموں سے فارغ ہو کر وہ اپنا اسکول کا کام لے کر بیٹھ جاتا۔ اسکول کا کام کر کے وہ کچھ دیر بستی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے باہر

Pdf by Aswad Raza

نکل جاتا۔

پھر شام کو خدا بخش اپنے کام سے واپس آتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے آتا پھر وہ دونوں مل کر رات کا کھانا پکاتے جو صبح بھی ناشتے میں کام آتا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے دادا کے ٹانگیں اور پاؤں دبانے بیٹھ جاتا۔ خدا بخش بہت منع کرتا لیکن وہ نہ مانتا۔ کہتا ”دادا! مجھے اپنے پاؤں دبانے دو۔ اپنی خدمت کرنے دو۔“

”نہیں تو کیا ہو جائے گا؟“ خدا بخش پوچھتا۔

”مجھے جنت کیسے ملے گی؟ مجھے مغفرت کیسے ملے گی؟“

”یہ تمہیں کس نے بتایا؟“

”یہ مجھے مولوی جی نے بتایا۔“ خورشید بولا۔ ”وہ کہا کرتے تھے کہ بزرگوں کی خدمت کرنے سے مغفرت ملتی ہے جنت ملتی ہے۔ جو بچے اپنے بزرگوں کی خدمت نہیں کرتے انہیں ہمیشہ دوزخ کی آگ جلاتی ہے۔“

”شاباش بیٹا! اللہ تجھے خوش رکھے۔“ خدا بخش کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔

”دادا! مولوی صاحب بہت اچھے آدمی تھے انہیں مجھ سے بہت محبت تھی۔ دادا وہ اتنی جلدی کیوں مر گئے؟ اچھے لوگ اتنی جلدی کیوں مر جاتے ہیں؟“

”بیٹا! بات اچھے برے کی نہیں موت کا ایک دن مقرر ہے جب وہ آ جاتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں۔“

”انہیں کس نے مارا تھا؟“

”پتا نہیں آج تک ان کے قاتل کا پتا نہیں چل سکا۔“ خدا بخش نے کہا۔

”دادا! اگر کبھی مجھے ان کا قاتل مل گیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ خورشید جوش میں آ گیا۔

”ہاں جی تو میرا بھی چاہتا ہے لیکن وہ ہمیں ملے گا نہیں۔“

”مولوی جی کے قاتل کے علاوہ مجھے ایک قاتل کی اور تلاش ہے۔“

”ایک قاتل کی اور تلاش ہے؟“ خدا بخش نے اسے چونک کر دیکھا۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟“

”ہاں دادا! اس قاتل کی جس نے میری ماں کو مارا۔“ خورشید نے غصے سے کہا۔ ”میں ایک دن کراچی جاؤں گا اور اپنی ماں کے قاتل کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”نہیں بیٹا ایسی باتیں نہیں کرتے۔ کسی کو قتل کرنا دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ تیری ماں کے ساتھ جو کچھ ہوا تو اس سے واقف نہیں۔ میں زیادہ جانتا ہوں۔ وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے لیکن سزا کا معاملہ انسانوں کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ یہ اللہ کا کام ہے۔ تو اس بات پر یقین رکھ کہ وہ سزا سے بچ نہ سکے گا۔ اسی زمین پر اسے سزا ملے گی۔ تو اپنے دل سے اس طرح کی باتیں نکال دے۔ صبر کرنا سیکھ۔“ خدا بخش جب اپنے پوتے کو سمجھا رہا تھا تو اسے معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اندر سے اسے بھی ان باتوں پر یقین نہیں ہے۔

وہ خود یہ چاہتا تھا کہ اللہ اس معاملے کو نہ چھوڑے۔ خود کراچی جائے قربان کو ڈھونڈے اور اس کی زندگی کا خاتمہ کر کے آ جائے لیکن وہ اپنی سوچ کو اس پر مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ زندگی گزار چکا تھا اور خورشید نے ابھی زندگی گزارنی تھی۔ وہ اسے منتقم المزاج بنا کر ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

صابرہ کی موت کا خدا بخش نے گہرا اثر لیا تھا۔ وہ اس معاملے میں خود کو مجرم گردانتا تھا۔ اس نے کیوں زبردستی اس کی شادی کی جس سے دو روٹی بچانے کے لیے۔ اسی صدمے نے خدا بخش کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ آئے دن بیمار رہنے لگا۔

دو تین دن سے اسے بخار تھا لیکن وہ بخار میں بھی مزدوری کے لیے نکلتا رہا۔ بڑھاپا، کمزوری اور سخت مشقت آخر کب تک چلتی۔ ایک دن صبح اس سے اٹھا نہ گیا۔ دادا کو بخار میں مبتلا دیکھ کر خورشید بہت پریشان ہوا۔ اس نے اسکول سے چھٹی کرنا چاہی لیکن دادا خدا بخش نے اسے ایسا کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔

”بیٹا! جلدی جا اسکول سے چھٹی نہیں کرتے۔ میں اتنا بیمار تھوڑا ہی ہوں تھوڑا سا بخار ہی تو ہے ابھی باہر جا کر حکیم جی سے دوا لے لوں گا تم اسکول جاؤ۔“

خورشید نہ چاہتے ہوئے بھی اسکول چلا گیا۔ دادا کا حکم جو ماننا تھا۔ لیکن اسکول میں اس کا جی نہ لگا۔ اسے بار بار دادا جی یاد آتے رہے بیمار اور کراہتے ہوئے۔

وہ اسکول سے آتے جاتے روز دربار کے پاس سے گزرتا تھا۔ آج واپسی پر اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے دادا کی شفایابی کے لیے دربار میں دعا مانگے۔ اسے پکی امید تھی کہ دربار والے صاحب کی دعا سے دادا جی ضرور اچھے ہو جائیں گے۔

جب وہ دربار سے دعا مانگ کر گلے میں بستہ لٹکائے سیڑھیاں اتر رہا تھا تو اس نے ایک چمچماتی کار سے ایک خوبصورت عورت کو اترتے دیکھا۔ وہ عورت کالی چادر میں لپٹی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ خورشید اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ خورشید کا رواں رواں جیسے آنکھ بن گیا تھا۔

وہ رک گیا۔ ایک طرف کو ہو گیا۔ وہ عورت اس کے قریب سے گزری۔ اس نے ایک نظر خورشید کو دیکھا۔ جانے کیوں خورشید کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھ گیا۔ اس عورت نے مسکراتے ہوئے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور اندر چلی گئی۔

چمچماتی گاڑی دیکھ کر گاڑی کے گرد کچھ بچے اکٹھا ہو گئے۔ ان میں کچھ بچے اسکول کے تھے اور کچھ مزار کے ارد گرد بھیک مانگنے والے تھے۔ کچھ بڑے بھی تھے جو اس حسین عورت کو گاڑی میں سے اترتا دیکھ کر قریب آ گئے تھے۔

وہ عورت تھوڑی دیر مزار کے اندر رہی پھر واپس آ گئی۔ اتنی دیر میں باہر سے دیکھنے کے لیے تماشا ہی لگ چکا تھا۔

ایک بچے نے پتھر اٹھایا اور جوش میں آ کر گاڑی کی طرف پھینکا۔ وہ پتھر گاڑی کے شیشے پر لگا۔ خورشید کو یہ دیکھ کر بڑا غصہ آیا۔ یہ پتھر اس عورت کو بھی لگ سکتا تھا۔ اس کے اندر ایک ابال سا پیدا ہوا۔ اس نے اس لڑکے کو پکڑ کر جو عمر میں اس سے بڑا تھا ایک گھونسا مارا اور دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ لڑکا تیزی سے اٹھا اور پھر وہ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ ان دونوں میں اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔ خورشید کی قمیص پھٹ گئی، چہرے پر کچھ خراشیں بھی آ گئیں لیکن خورشید بہت جوش میں تھا۔ اگر وہ عورت ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہ کرتی تو وہ اس لڑکے کا کچومر بنا دیتا۔ اس عورت نے جیسے ہی قریب آ کر کہا ”لڑکے چھوڑ دو اسے۔“ تو خورشید فوراً اس کے سینے سے اتر آیا۔

وہ عورت اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ خورشید اسے اپنے قریب پا کر شرما گیا۔ اس نے ایک مرتبہ اور اسے سلام کیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ وہ شیریں لہجے میں بولی۔

”خورشید احمد خان۔“

”اوہ یہ تو بڑا زبردست نام ہے۔“ اس عورت نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پڑھتے ہو؟“

”جی۔“ خورشید نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کس کلاس میں؟“ اس نے پوچھا۔

”پانچویں جماعت میں۔“ خورشید نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ اس عورت نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ”اچھا یہ بتاؤ تم نے اس لڑکے کو کیوں مارا؟“

”اس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ میرے دادا کہتے ہیں کہ جو لوگ عورت کی عزت نہیں کرتے اس سے محبت کا سلوک نہیں کرتے، انہیں اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔“

اس عورت کی آنکھوں میں حیرت نمایاں ہو گئی۔ بولی۔ ”تمہارے دادا تو کوئی بہت بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے ابا کیا کام کرتے ہیں؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ خورشید نے بتایا۔ ”ان کے مرنے کے بعد میرے دادا نے میری ماں کی دوسری شادی کر دی لیکن ان لوگوں نے اس پر بہت ظلم کیے۔ وہ بھی مر گئی۔ میرے دادا کو میری ماں کے مرنے کا بہت صدمہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری ماں ان کی غلطی سے مری۔ وہ یہ بات مجھ سے چھپاتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اس صدمے سے بیمار رہنے لگے ہیں۔ آج بھی انہیں بخار تھا۔ میں یہاں اپنے دادا کے لیے دعا کرنے آیا تھا۔“

سارا مجمع خورشید اور اس عورت کی گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اس عورت نے جلدی سے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس نے خورشید کی طرف بڑھایا۔ ”یہ لو یہ رکھ لو اپنے پاس۔“

”آپ نے کیا مجھے فقیر سمجھا ہے۔ مجھے خیرات دے رہی ہیں؟“ خورشید نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

”نہیں تو۔“ وہ بڑے پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ”یہ تمہاری بہادری کا انعام ہے پھر دیکھو تمہاری قمیص بھی پھٹ گئی ہے۔ ایسا میری وجہ سے ہوا ہے نا۔“

”میں جانتا ہوں جی آپ مجھے غریب سمجھ کر پیسے دے رہی ہیں۔ میں یہ پیسے ہرگز نہیں لوں گا۔“ خورشید نے بڑے وثوق سے کہا۔

یہ سن کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی بولی۔ ”اچھا ٹھیک ہے پیسے مت لو آؤ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں، شریف بچے پھٹی قمیص پہن کر نہیں چلا کرتے راستے میں لوگ تمہارا مذاق اڑائیں گے۔“

یہ بات خورشید کی چھوٹی سی عقل میں فوراً سما گئی۔ وہ زندگی میں کبھی کار میں نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے سوچا مفت کی سیر ہو جائے گی پھر وہ گھر پر ایسی چمچماتی گاڑی سے اترے گا تو گلی کے لوگ حیران رہ جائیں گے۔ وہ فوراً ڈرائیور کے پاس آگے بیٹھ گیا۔ وہ عورت گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ پھر وہ کار مجمع کو حیران پریشان چھوڑ کر ان کے درمیان سے نکل گئی۔

اس عورت نے خورشید کو نہ صرف گھر پر چھوڑا بلکہ وہ خدا بخش سے بھی ملی۔

اس وقت خدا بخش دروازے پر کھڑا پڑوس کے ایک لڑکے سے باتیں کر رہا تھا۔ اسکول کی کب کی چھٹی ہو گئی تھی۔ بستی کے دوسرے لڑکے اسکول سے واپس آ چکے تھے لیکن خورشید ابھی تک نہیں آیا تھا اور وہ اس لڑکے سے اسی خورشید کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ ایک بڑی سی گاڑی گلی کے اس سرے پر رکی۔

اس گاڑی سے جب خورشید ایک عورت کے ساتھ اترا تو خدا بخش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ وہ کوئی بہت خوبصورت عورت تھی جو ایک زرق برق ساڑی باندھے ہوئے تھی اور اوپر سے اس نے ایک کالی چادر لی ہوئی تھی۔ وہ بڑی تمکنت سے خورشید کا ہاتھ تھامے اس کے دروازے کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کچی بستی میں ایسی عورت کا تصور بھی محال تھا لیکن وہ تو مجسم ہو کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

خدا بخش ان دونوں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ خورشید کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا ”یہ ہیں میرے دادا۔“

”اچھا۔“ اس عورت نے خدا بخش کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ ”میں آپ کے پوتے سے بہت متاثر ہوئی ہوں آپ نے اس کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔“

”آپ اندر چلیں ہمارے گھر میں۔“ خورشید نے اس عورت سے کہا۔

”جی آپ اندر آ جائیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو۔“ خدا بخش نے

UrduPhoto.com

Pdf by Aswad Raza

لجاجت سے کہا۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں آپ کی طبیعت کیسی ہے، آپ کا پوتا آج داتا دربار آپ کے لیے دعا مانگنے گیا تھا۔" وہ عورت ان کے گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "میں بھی داتا دربار اسی مقصد کے لیے گئی تھی یعنی دعا کے لیے، جب باہر آئی تو آپ کے خورشید سے ملاقات ہوگئی۔" یہ کہہ کر اس عورت نے تفصیل سے ساری بات بتائی۔

ساری روداد سنا کر اس عورت نے پھر اپنا تعارف کرایا۔ اس کے جانے کے بعد خدا بخش نے خورشید کو اپنے گلے سے لگا کر پیشانی چومی اور پیار سے اس کے گال پر چپت مار کر بولا۔ "واہ، استاد تُو تو بڑا زبردست بندہ نکلا، ایک دم آ نا اور چھا جانا، ماردیا، جانتا ہے یہ کون تھی؟"

"کون تھی دادا؟"

"یہ فلم ایکٹریس تھی۔"

خورشید نے آج تک کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ایکٹریس کیا ہوتی ہے۔ وہ بولا۔ "ایکٹریس کسے کہتے ہیں دادا؟"

"تجھے نہیں معلوم، ہاں تجھے کہاں معلوم ہوگا۔ ایسا کرتے ہیں ذرا میرا بخار اُتر جائے پھر میں تجھے لے چلوں گا اس کا کمال دکھانے۔"

"کیا یہ سرکس میں کام کرتی ہے؟"

"ارے نہیں بھئی، یہ فلم میں کام کرتی ہے، فلم کی ہیروئن ہے۔"

"اچھا چھوڑیں دادا، ہوگی کچھ، تم یہ بتاؤ بیگم جی سے دوائی لائے تھے؟"

"لایا تو تھا مگر اب مجھے دوا کی کیا ضرورت ہے میرا بیٹا اتنے بڑے دربار میں میرے لیے دعا کر آیا ہے۔ اب تو میں ٹھیک ہوگیا، دیکھو اب مجھے بخار بھی نہیں ہے۔"

"سچ دادا!"

"ہاں بیٹا!" خدا بخش نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "آج میں بہت خوش ہوں تُو نے میرا سر فخر سے بلند کردیا، آج اگر مولوی جی زندہ ہوتے تو وہ یہ سب جان کر کتنا خوش ہوتے۔ بیٹا میں نے تیرے باپ کو بھی پڑھانا چاہا تھا لیکن اس نے پڑھ کر ہی نہ دیا۔ اسے مولوی جی کے پاس بٹھایا وہاں سے بھاگا، اسکول میں داخل کرایا وہاں ایک دن بھی نہ گیا۔ بیٹا میں چاہتا تھا کہ تیرا باپ میری طرح مزدور نہ بنے پڑھ لکھ کر کما کر کھائے۔ تجھے آج ایک بات بتاؤں، میرا باپ یعنی تیرا پردادا مزدور نہ تھا، زمیندار تھا۔ میں اس کی اکلوتی اولاد تھا جس طرح فضل دین میری اکلوتی اولاد تھا اور جس طرح تُو فضل دین کی اکلوتی اولاد ہے۔"

"پھر دادا، تم مزدور کیسے بن گئے؟"

"بس بیٹا، یہ سب قسمت کے کھیل ہوتے ہیں۔ میرے باپ کو زمینوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے کھیل ہی نرالے تھے۔ اسے گاؤں بھی اچھا نہ لگتا تھا وہ شہر کا رسیا تھا، شہر کے رہنے والوں کا عاشق تھا، وہ بھاگ بھاگ کر شہر آتا تھا۔ ساری زمینیں اس نے بٹائی پر دے رکھی تھیں۔ شہر میں اس نے ایک بُری عورت سے دوستی کرلی تھی۔ تُو ابھی چھوٹا ہے ساری باتیں نہیں سمجھ سکے گا، بس خاموشی سے سنتا رہ۔ اس عورت کے چکر میں اس نے سب کچھ برباد کردیا۔ ساری زمینیں اونے پونے فروخت کردیں۔ ان دنوں میں تیرے برابر تھا۔ اسکول سے گھر آتا تو اپنی ماں کو روتا ہوا پاتا۔ ماں کیوں روتی تھی، بتاتی نہ تھی، وہ بتاتی بھی تو میری سمجھ میں نہ آتا۔ جب میں بڑا ہوا تو میری سمجھ میں سب کچھ آگیا لیکن اس وقت تک میرے پاس کچھ نہ رہا تھا۔ نہ باپ، نہ ماں، نہ زمین جائداد۔ بس میں تھا اور دنیا کے جھمیلے تھے۔ ساری زمینیں بک چکی تھیں بس ایک مکان رہ گیا تھا جس میں ہم ماں بیٹے رہتے تھے۔ ایک دن اس کے بکنے کی بھی خبر آگئی۔ وہ مکان چچا زاد بھائیوں نے خرید لیا تھا اور اب وہ اس مکان کا ہم سے قبضہ لینے آئے تھے۔ میری ماں نے سنا تو اسے چکر سا آگیا۔ شوہر اس کا نہ رہا تھا، زمین اس کے پاس نہ تھی۔ ایک مکان تھا سر چھپانے کے لیے اب وہ بھی نہ رہا تھا۔ وہ چکرا کر زمین پر گری تو پھر نہ اٹھ سکی۔ اس نے اپنے گھر سے اپنی زندگی میں قدم باہر نہ نکالا۔ اس گھر سے اس کا جنازہ اٹھا۔ ماں کے اٹھنے کے بعد میں بالکل تنہا رہ گیا۔ میری تعلیم نامکمل رہ گئی۔ میں پانچویں جماعت سے آگے نہ پڑھ سکا حالانکہ میں پڑھنا چاہتا تھا، مجھے پڑھائی کا شوق تھا، وہ اتنا مشکل وقت تھا کہ پڑھنا تو دور کی بات ہے مجھے کوئی ایک وقت کی روٹی کھلانے کو تیار نہ تھا۔ پھر بیٹا میں نے بڑی مشکل زندگی گزاری، ایسی مشکل کہ اب یاد کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں نے فاقے کیے لیکن کبھی بھیک نہ مانگی، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔"

"پردادا نے بھی تمہاری خبر نہ لی؟"

"بیٹا، پردادا کو اپنی خبر نہ رہی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس عورت کے در پر پڑے رہتے تھے۔ اس نے اس وقت تک تو ان کے آؤبھگت کی جب تک ان کے پاس پیسہ رہا، جونہی وہ خالی ہوئے اس نے انھیں اٹھا کر باہر پھنکوا دیا۔ وہ بھکاریوں کی طرح اس کے دروازے پر پڑے رہتے تھے یہاں تک کہ انھوں نے اسی کی چوکھٹ پر جان دے دی۔ بُرے کاموں کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔" خدا بخش نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کیا عورتیں بُری بھی ہوتی ہیں دادا؟" خورشید نے سوال کیا۔

"نہیں بیٹا کوئی عورت بُری نہیں ہوتی، یہ تو ہم مرد لوگ اسے بُرا بناتے ہیں اور جب وہ بُری بن جاتی ہے اور بُری بن کر اپنے اوپر کیے گئے ظلموں کا بدلہ لیتی ہے تو پھر ہم تلملاتے ہیں اور اسے ناگن، ڈائن اور جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں۔ کائنات میں سب سے پہلے مرد کی تخلیق ہوئی، بعد میں اسی سے عورت کو پیدا کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے آج تک مردوں کے بنائے ہوئے قوانین کا رواج ہے۔ مرد نے عورت کو جس روپ میں دیکھنا چاہا وہ ویسی بن گئی پھر عورت بُری کیسے ہوئی وہ تو تمہاری تابعدار ہے، تمہاری غلام ہے۔"

"پھر تو عورت بہت مظلوم ہے بالکل میری ماں کی طرح۔" خورشید کی نگاہوں میں اپنی ماں کا چہرہ آگیا۔

"ہاں بیٹا، عورت بہت مظلوم ہے۔" خدا بخش کی آنکھوں میں بھی وہی چہرہ تھا۔

"میں عورت کو اس ظلم سے نجات دلاؤں گا۔" خورشید نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔

"مگر وہ کس طرح بیٹے؟" خدا بخش نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

"دادا، یہ تو مجھے معلوم نہیں، خیر میں بڑا ہو جاؤں گا تو اور باتوں کی طرح یہ بھی مجھے معلوم ہو جائے گا۔" خورشید نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"عورت کو ظلم سے نجات دلانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔ بیٹا، کسی عورت کی روح طوائف نہیں ہوتی، کسی عورت کی روح ایکٹریس نہیں ہوتی، وہ تو بس نازک بیل کی طرح ہوتی ہے اسے جہاں چاہو چڑھا دو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہارے پردادا کے معاملے میں، میں نے اس عورت کو کبھی قصوروار نہیں گردانا۔ قصوروار میرا باپ تھا جس نے میری ماں کے حقوق پر ڈاکا ڈالا اور اس سے سب کچھ چھین لیا لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ میرا باپ اپنے کالے کرتوتوں کے ہاتھوں ایک غیر عورت کی چوکھٹ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ ایک آدمی کا اس سے بھیانک انجام کیا ہو سکتا ہے...؟" خدا بخش نے سرد آہ بھر کر کہا۔

اس واقعے کو ابھی دو چار روز ہی ہوئے تھے کہ شام کے وقت وہ بڑی سی گاڑی ایک مرتبہ پھر اس کچی بستی میں داخل ہوئی۔ گاڑی میں صرف ایک ڈرائیور تھا۔ اس نے خدا بخش کو بیگم صاحبہ کا پیغام دیا۔

"آپ کو بیگم صاحبہ نے یاد کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اگر میری طبیعت ٹھیک ہوتی تو میں خود آپ کو لینے آتی۔" ڈرائیور نے صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "خورشید میاں کہاں ہیں؟"

"میں نے اسے سبزی لینے بھیجا ہے، آتا ہی ہوگا، وہ آجائے تو پھر چلتے ہیں۔ بیگم صاحبہ نے ہمیں یاد کیا، یہ ان کی عزت افزائی ہے ہمارے لیے بہت ہے۔" خدا بخش نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "میاں تمھیں کچھ اندازہ ہے کہ انھوں نے ہمیں کیوں بلایا ہے؟"

"بزرگو، مجھے تو انھوں نے کچھ بتایا نہیں، بس اتنا کہا کہ ان دونوں کو جا کر لے آؤ۔" ڈرائیور نے کہا۔

خورشید کے آنے کے بعد وہ دونوں خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ خدا بخش حیران تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مہربانی کا مطلب کیا ہے۔ خورشید گاڑی میں بیٹھ کر بہت خوش تھا۔ اسے جہاں گاڑی میں بیٹھنے کی خوشی تھی تو وہاں بیگم صاحبہ سے ملاقات کی بھی مسرت تھی۔

بیگم صاحبہ کا اصلی نام تو کسی کو معلوم نہ تھا، شاید اب انھیں بھی یاد نہ رہا تھا۔ فلمی نام سب جانتے تھے۔ نادرہ تھا اس کا نام۔ نادرہ نے خدا بخش کو زیادہ دیر تذبذب میں مبتلا نہ کیا۔ اس نے پہلے ہی دن اپنا مقصد بیان کر دیا۔ "میں خورشید کو اپنے پاس رکھ کر پڑھانا چاہتی ہوں۔"

یہ سن کر خدا بخش کی غیرت جاگ اٹھی۔ "بیگم صاحبہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بابا جی پہلے آپ میری پوری بات سن لیں پھر کچھ فیصلہ کریں۔" نادرہ بولی۔

نادرہ کی زبان سے بابا جی سن کر ان کی نگاہوں میں صابرہ گھوم گئی۔ خدا بخش نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "جی کہیں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"میری شادی ہوئے آج دس سال کا عرصہ بیت چکا ہے۔ میں نے اپنی پہلی فلم ہٹ ہوتے ہی شادی کرلی تھی۔ دس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود میں آج تک اولاد سے محروم ہوں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے جیسے میرے پاس کچھ نہیں۔ میرے شوہر بھی مجھ سے دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یوں بھی انھوں نے میری شہرت اور دولت سے متاثر ہو کر شادی کی تھی ورنہ اس میں ان کا بھی اتنا قصور نہیں، اس فلم نگری میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ یہاں دولت کو ہر معاملے میں اوّلیت دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں شادیاں بھی کاروبار ہوتی ہیں، محض پیسے کے لیے ہوتی ہیں۔ ایسی شادیوں کا گھر کی اصل خوشیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ آپ میری شادی بھی ایسی ہی سمجھیں۔ مجھے زندگی کی ہر آسائش حاصل ہے لیکن ذہنی سکون میسر نہیں، سچی خوشی جیسے کہیں کھو گئی ہے۔ ڈرتی ہوں اگر اس طرح کی زندگی میں مزید گزاروں تو کہیں خودکشی نہ کر بیٹھوں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی شریف خاندان کے ذہین لڑکے کو گود لے لوں۔ آپ کو شاید خورشید کی ذہانت کا صحیح اندازہ نہیں، یہ بچہ بہت سمجھدار اور خوددار ہے۔ اس کی سوچ اس کے ہم عمر بچوں سے کہیں زیادہ آگے ہے۔ میں اسے معاشرے میں اس کا صحیح مقام دلاؤں گی اور یہ سب میں کیوں کروں گی، معلوم ہے؟"

"نہیں معلوم۔" خدا بخش نے سادگی سے کہا۔

"میں اس سے اس کے اچھے مستقبل کے عوض صرف اپنے بڑھاپے کا سہارا مانگوں گی۔ ابھی مجھے اس کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے ابھی میں جوان ہوں، میرے پاس پیسہ ہے پھر ایک ایک کر کے یہ سب کچھ مجھ سے چھنتا جائے گا۔ میرے شوہر کا ساتھ نمائشی ہے۔ ہاتھی کے دانت کی طرح ہے، اندر کچھ باہر کچھ۔ ابھی تو وہ مجھ سے شہد کی مکھی کی طرح چپٹا ہوا ہے۔ جیسے ہی میرے پاس دولت کا شہد ختم ہوگا، وہ فوراً اُڑ جائے گا پھر مجھے کون سنبھالے گا۔ میں نے آپ سے تمام باتیں پوری سچائی سے کہہ دی ہیں، کچھ نہیں چھپایا ہے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ کو اس سلسلے میں اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہو تو آپ میرے یہاں کام کرنا شروع کردیں۔ میرے گھر میں ملازموں کی ایک لمبی قطار ہے اور وہ سب کے سب نکمے اور کام چور ہیں۔ آپ ان کے نگران بن جائیں۔ اس طرح یہ ہوگا کہ آپ کا پوتا آپ کی نگاہوں میں بھی رہے گا اور آپ میرے گھر میں رہتے ہوئے تنگی بھی محسوس نہیں کریں گے۔"

UrduPhoto.com
meemUrdu.com

Pdf by Aswad Raza

یہ ایک بڑی پرکشش پیش کش تھی، اس پیش کش میں عزت بھی تھی اور اس میں وہ تمام خواب سمٹے تھے جو ایک دادا اپنے پوتے کے لیے دیکھ سکتا تھا۔ وہ سب خواب اُسے حقیقت کا روپ دھارتے نظر آرہے تھے۔

"کیوں بیٹے خورشید کیا کہتے ہو؟" خدا بخش نے خورشید سے پوچھا اُس نے نادرہ کی تمام باتیں سن لی تھیں۔

"دادا! تم میرے ساتھ یہاں رہو گے پھر تو ٹھیک ہے۔" خورشید نے فوراً فیصلہ سنایا۔

"ہاں بیٹا! میں تجھے چھوڑ کر کہاں جاؤں گا میں تیرے ساتھ رہوں گا۔"

"دادا! پرامس۔" خورشید نے جیسے وعدہ لیا۔

"ہاں بیٹا! پرامس۔" خدا بخش نے جیسے وعدہ کرلیا وہ جانتا تھا کہ وعدے میں کتنا دم ہے۔ موت نے بھلا کس کو کس کے ساتھ رہنے دیا ہے۔

خدا بخش خورشید کے یہاں آنے کے بعد تین سال اور زندہ رہا جب وہ مرا تو اس کے چہرے پر آسودگی تھی، اطمینان تھا۔

نادرہ نے خورشید کو لاہور کے سب سے اچھے اسکول میں داخل کرا دیا اور اسے اپنے ساتھ لے کر اس کے لیے اچھے اچھے لباس خریدے کئی جوڑے جوتوں کے لیے۔ اب وہ گاڑی میں اسکول جاتا، اسی گاڑی میں اسکول سے واپس آتا، گھر پر پڑھانے کے لیے ایک بہترین ٹیوٹر رکھا گیا۔ اس طرح نادرہ نے اسے وہ تمام آسائشیں میسر کردیں جس کی وہ تمنا کرسکتا تھا، غربت کی زندگی میں محض خواب دیکھ سکتا تھا۔

اُدھر خدا بخش بھی خوش تھا، سارے ملازم اس کی عزت کرتے تھے، وہ سب کے سب اس کے تابع تھے۔ وہ دن بھر حکم چلاتا اور حقہ گڑگڑاتا، اب وہ اپنے پوتے کو خورشید صاحب کہنے لگا تھا۔ انداز تخاطب میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔

"ہاں تو خورشید صاحب کسی دن ہم غریبوں کو بھی موٹر کی سیر کرا دیں۔" وہ اُسے چھیڑتا۔

"دادا! اب تم میرے ساتھ مذاق نہ کرو۔"

"ارے صاحب! ہماری یہ جرأت! یہ مجال!" خدا بخش ہنس کر کہتا۔

"دادا! اس طرح بات کرو گے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"ارے ارے خورشید! کیا ہوا؟" نادرہ نے اچانک کمرے میں داخل ہوکر کہا۔ "بابا جی کیا کہہ رہے ہیں؟"

"مجھے خورشید صاحب کہہ رہے ہیں میرے ساتھ بڑے ادب سے بات کر رہے ہیں۔" خورشید نے شکایت کی۔

"تو یہ تو کوئی بُری بات نہیں۔" نادرہ نے ہنس کر کہا۔

"بیگم صاحبہ! ہے نا بُری بات، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں دادا ہوگیا ہوں اور یہ پوتے ہو۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم مجھے بیگم صاحبہ کیوں کہتے ہو؟"

"پھر مجھے کیا کہنا چاہیے؟"

"امی جی۔" نادرہ نے کہا۔

"امی جی تو میں آپ کو نہیں کہہ سکتا۔" خورشید نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا۔

"ارے کیوں؟" نادرہ پریشان ہوگئی۔

"آپ گڑیا سی تو ہیں، میں امی کہہ کر آپ کو زیادہ عمر کا نہیں بنانا چاہتا، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"پھر کیا کہوگے؟" نادرہ نے پوچھا۔

"میں آپ کو باجی کہوں گا، نادرہ باجی۔"

"چلو ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔" نادرہ نے خوش ہوکر کہا۔ "اسی خوشی میں کہیں گھومنے چلتے ہیں، بابا! آج آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔"

"بیٹی مجھے تو زیادہ گھومنے پھرنے کا شوق نہیں، تم خورشید کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔" خدا بخش نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" نادرہ نے کہا۔ "خورشید تم تیار ہو؟"

"جی باجی۔" خورشید ہنس کر بولا۔

ان کے جانے کے بعد کوٹھی کے گیٹ میں ایک سُرخ رنگ کی گاڑی داخل ہوئی۔ اسے ایک مرکی مونچھوں والا سُرخ سفید خوبصورت سا آدمی چلا رہا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر کوٹھی میں داخل ہوا، اندر داخل ہوکر سب سے پہلے اس کی نظر خدا بخش پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی اس کا موڈ خراب ہوگیا۔

"خدا بخش!" وہ کرخت لہجے میں چلایا۔

"جی صاحب!" خدا بخش نے نرم لہجے میں کہا۔

"بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟"

"جی وہ گاڑی لے کر سیر کو نکلی ہیں۔" خدا بخش نے بتایا۔

"کس کے ساتھ گئی ہیں؟"

"جی وہ ڈرائیور ہے اور خورشید ہے۔"

"لیکن میں نے ٹیلی فون کرکے بتایا تھا کہ وہ گھر پر رہیں ایک پارٹی آنے والی ہے، پھر بھی وہ چلی گئیں۔" اس نے خدا بخش کو گھورتے ہوئے کہا۔ جیسے اُس نے نادرہ کو بھیج دیا ہو۔ "اس چھوکرے نے تو میرا دماغ خراب کر دیا، پتا نہیں اُسے کہاں سے پکڑ لائی ہے۔ اب پکڑ لائی ہے تو اُسے سرونٹ کوارٹر میں رکھے، ہر وقت اُسے اپنے ساتھ کہاں چپکائے پھرتی ہے۔ تم لوگوں نے کیا جال پھیلا رکھا ہے؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں صاحب، بیگم صاحبہ اپنی مرضی سے ہمیں لائی ہیں، آپ ناراض نہ ہوں، بیگم صاحبہ سے کہہ دیں، ہم چلے جائیں گے۔" خدا بخش نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"اچھا مجھے زیادہ ہدایت دینے کی ضرورت نہیں ہے میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔ تم ذرا کچن میں جاکر دیکھو کھانے کا کیا حال ہے" یہاں

بیٹھے کیا کرتے رہتے ہو؟" اس نے خواہ مخواہ خدا بخش کو ڈانٹ پلائی۔

یہ موٹی مونچھوں والے صاحب نادرہ کے شوہر تھے خالد لاثانی۔ مزاج کے انتہائی تیز طرار تھے، ملازموں سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ ریس کے رسیا تھے، جوئے سے بھی شوق تھا، شراب بھی پیتے تھے۔ گویا فلموں والے سارے شوق ان میں موجود تھے، وہ ایک ناکام ہدایت کار، ناکام فلمساز اور ناکام مصنف اور ناکام شوہر تھے لیکن اس بات کو مانتے نہیں تھے۔

زندگی میں بس ایک کامیابی انہیں نصیب ہوئی تھی اور وہ تھی نادرہ۔۔۔ نادرہ اگر انہیں نہ ملتی تو وہ آج کسی فلم اسٹوڈیو کے دروازے پر دربان بنے بیٹھے ہوتے۔ صورت کی طرح انہوں نے نصیب بھی اچھا پایا تھا۔ بغیر کچھ کیے عیش کیے جاتے تھے۔ نوٹوں سے بھری ہوئی تجوری ان کے لیے موجود تھی، وہ گھر سے نکل کر اسٹوڈیو جا بیٹھتے۔ وہاں دن بھر کے کام خراب کرتے، آئندہ فلمسازی کے منصوبے بناتے، آنے والے فلمسازوں کو اپنی بیوی کی تاریخیں دیتے۔ ان سے ایڈوانس پکڑتے اور نادرہ کو یہ سب بعد میں معلوم ہوتا کہ ان کے شوہر کہاں کہاں اس کی تاریخیں بانٹ آئے ہیں، کہاں کہاں انہوں نے نئی فلموں کے معاہدے کیے ہیں، کتنی ایڈوانس رقم لی ہے، وہ ان معاملات میں اپنے شوہر سے الجھتی نہ تھی اور وہ اس کے کیے معاہدوں اور اٹکل پچو دی ہوئی تاریخوں کا پاس کرتی تھی لیکن پھر اسے شکایتیں موصول ہونے لگیں۔ فلمساز اس کے شوہر لاثانی کی وعدہ خلافی کی شکایت کرتے۔ وہ جس کو چاہتا نادرہ کی تاریخیں دیتا، جس کو چاہتا اس کی تاریخیں منسوخ کردیتا، معاہدوں اور پیشگی رقموں کا پورا حساب کتاب لاثانی رکھتا تھا، اُسے صرف کاغذ پر دستخط کرنے ہوتے۔ اُسے یہ نہ معلوم ہوتا کہ کس فلمساز سے لاثانی نے کیا لیا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ بھی گھٹنے لگا، پھر نادرہ نے معاہدوں پر نظر رکھنا شروع کردی کہ تاریخوں کے بارے میں لاثانی سے کہہ دیا کہ وہ تاریخیں دیتے وقت اس سے بھی مشورہ کرے۔ یہ باتیں لاثانی کو بہت بُری لگیں، یہاں سے اُن دونوں میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ ابھی یہ معاملات چل ہی رہے تھے کہ درمیان میں یہ خورشید آگیا۔

لاثانی کو خورشید بالکل پسند نہ آیا۔ وہ خواہ مخواہ اس سے جلنے لگا، ناراض رہنے لگا۔

نادرہ اور خورشید کافی دیر سے گھر لوٹے۔ اس دوران لاثانی کے سینے پر سانپ لوٹتا رہا۔ وہ ادھر سے اُدھر ٹہل ٹہل کر ملازموں پر برستا رہا۔ جب نادرہ، خورشید کا ہاتھ پکڑے کوٹھی میں داخل ہوئی تو لاثانی نے سب سے پہلے یہ سوال کیا۔

"کہاں گئی تھیں تم؟" اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

اس کے لہجے کے تحکم پر نادرہ کو غصہ آیا تو تھا لیکن وہ اس غصے کو حسب معمول پی گئی۔ ہنستے ہوئے نرمی سے بولی۔ "میں خورشید کو لے کر گھومنے گئی تھی۔"

"لیکن میں نے تمہیں ٹیلی فون پر بتا دیا تھا کہ شام کو ایک پارٹی آنے والی ہے۔" لاثانی کے لہجے میں غصہ برقرار تھا۔

"خورشید تم اپنے کمرے میں چلو۔" نادرہ نے خورشید کو جانے کا اشارہ کیا جو خاموشی سے کھڑا لاثانی کو دیکھ رہا تھا۔ خورشید اس کا اشارہ پاکر جی باجی کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

"پارٹیاں تو آتی رہتی ہیں لیکن مجھے وقت کبھی کبھی ملتا ہے۔ آج میں نے آدھے دن کی شوٹنگ کر کے شام کو وقت بہ مشکل نکالا تھا۔ ان لوگوں کو کل صبح کا وقت دے دو، کون لوگ تھے؟"

"کون لوگ تھے یہ بات تم اب پوچھ رہی ہو، یہ بات تو تمہیں اسی وقت ٹیلی فون پر پوچھنا چاہیے تھی۔ اس وقت تو تم نے جانے کی جلدی میں فوراً ریسیور رکھ دیا۔ آج میری بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔"

"اچھا اب مجھے ان کا ٹیلی فون نمبر بتاؤ، میں انہیں رنگ کرکے معذرت کیے لیتی ہوں۔"

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا گھر سے نکلنا بہت ضروری تھا؟" وہ لڑنے پر آمادہ ہوگئے۔

"میں گھر نہیں تھی تو کیا ہوا، تم تو موجود تھے بات چیت کرلیتے۔" نادرہ نے کہا۔

"مجھے جو کرنا تھا وہ میں نے کرلیا، تم ساجد بھائی پکچرز والوں سے واقف ہو۔"

"ہاں واقف ہوں۔"

"ملک کا سب سے بڑا فلمساز ادارہ ہے۔"

"جانتی ہوں۔" نادرہ نے کہا۔ "ساجد بھائی پکچرز کے مالک شمسی صاحب آئے تھے کیا؟"

"جی، وہ تھے، ان کے ساتھ ہدایت کار کے انصاری تھے، تمہیں معلوم ہے کہ کے انصاری کسی آرٹسٹ کے گھر نہیں جایا کرتے لیکن وہ تم سے ملنے آگئے تھے۔"

"اچھا انصاری صاحب بھی تھے، چلو ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو میں ابھی ان دونوں سے ٹیلی فون پر معذرت کیے لیتی ہوں اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کسی سے معذرت کرنے کی عادی نہیں ہوں۔"

"یہ معذرت تم میرے لیے نہیں اپنے لیے کروگی، وہ یہاں میرے لیے نہیں تمہیں کاسٹ کرنے آئے تھے۔ اگر تم ابھی وعدہ کرو تو فلم انڈسٹری کے لوگ بہت جلد ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں، یہ یاد رکھو۔" خالد لاثانی کے لہجے کی کاٹ ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔

"خالد تم ایک بات بتاؤ، تمہیں کس بات پر غصہ ہے، اس بات پر کہ میں گھر پر موجود نہ تھی یا اس بات پر کہ میں خورشید کو لے کر سیر کرنے چلی گئی؟" نادرہ نے دوٹوک انداز میں بات کی۔

"مجھے دونوں باتوں پر غصہ ہے۔"

UrduPhoto.com

"مگر تم سے غیر حاضری کے لیے آج میں نے معذرت کر لی اب خورشید کے سلسلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم نے چند دنوں میں اسے ضرورت سے زیادہ اہم بنا لیا ہے، تم اُسے سرونٹ کوارٹر تک محدود کیوں نہیں کر دیتیں۔" خالد لاثانی کے دل میں جو تھا وہ فوراً زبان پر آ گیا۔

اور نادرہ اُس سے یہی اگلوانا چاہتی تھی وہ بولی "اچھا تو اصل بات یہ ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔"

"میں انھیں ایک بات سمجھا دوں خالد، میں ہمیشہ تمہارے لیے جھکی ہوں، تم نے جیسا کہا ہے کرتی رہی ہوں لیکن خورشید کے معاملے میں، میں تم سے کوئی سمجھوتا نہ کر سکوں گی۔"

"تم یہ بات کیا سوچ کر کہہ رہی ہو؟"

"میں تو خیر جو کچھ سوچ کر کہہ رہی ہوں، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن تم ابھی طرح سوچ لو۔"

"تم نے اُسے گھر میں رکھتے وقت مجھ سے پوچھا نہیں۔" خالد نے کہا۔

"اس کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"شوہر اور بیوی کے درمیان کوئی بات ذاتی نہیں ہوتی مشترک ہوتی ہے۔"

"یہ اصول ہے؟" سوال ہوا۔

"ہاں یہ اصول ہے۔" جواب ملا۔

"اسی اصول پر ایک مرتبہ پھر غور کر لو کیونکہ اس اصول کے تحت تم قدم قدم پر پھنسو گے اس لیے کہ اب تک میرے بارے میں تمام فیصلے خود کرتے رہے ہو مجھے تو معاہدہ ہونے کے بعد بتاتے ہو کہ میں نے یہ معاہدہ کر لیا ہے، فلاں کو تاریخیں دے دی ہیں، اُس وقت میری ذات کہاں گم ہو جاتی ہے؟"

"اچھا میں بحث نہیں کرنا چاہتا تم اُس چھوکرے کی بات کرو۔"

"وہ چھوکرا نہیں، اُس کا نام خورشید ہے اُس کا دماغ بھی آفتاب ہے ایک دن دیکھنا وہ بالکل سورج کی طرح چمکے گا، ایسا ذہین بچہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" نادرہ نے ہنستے جانے کے لیے اُس کی تعریف کی۔

"تم اگر اُس کی مدد کرنا چاہتی ہو تو انھیں کچھ دے دلا کر الگ کر دو۔" خالد نے کہا۔

"وہ لوگ غریب ضرور ہیں لیکن بھکاری نہیں، خورشید کے دادا نے اس گھر میں رہنا اُس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک میں نے انھیں ملازمت نہیں دے دی، میں نے انھیں ملازمت ضرور دی ہے لیکن میں انھیں ملازم نہیں سمجھتی میں انھیں اپنا بابا کہتی ہوں اور اب میرا خیال ہے یہ جاننے کے بعد تم بھی اُس شخص کی عزت کرو گے، رہ گیا خورشید اگر اُسے دے دلا کر ہی الگ کرنا ہوتا تو گھر میں کیوں لاتی، وہ اس گھر میں میرے بیٹوں میرے بھائیوں کی طرح رہے گا، دیکھو وہ مجھے باجی کہتا ہے، آج میں تم سے اس مسئلے پر پہلی اور آخری بار بات کر رہی ہوں، آئندہ نہیں کروں گی، اب خورشید اور بابا کو عزت دینا تمہارا کام ہے۔ میں نے زندگی میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا، جیسا تم نے کہا کیا ہے اب میں تم سے جیسا کہہ رہی ہوں ویسا تمہیں کرنا ہوگا۔"

یہ ساری باتیں نادرہ نے بڑے دھیمے انداز میں کہی تھیں لیکن اُس کے انداز میں کہیں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ خالد لاثانی نے اس وقت خاموشی اختیار کر لی۔ خالد نے اس روپ میں نادرہ کو پہلی بار دیکھا تھا، اُس نے سوچا، اگر اس نے مزید بات آگے بڑھائی تو ٹوٹ جائے گی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح کی بات ٹوٹے یا ان کے تعلقات میں کوئی بھاری دراڑ پڑ جائے۔ نادرہ اُس کے لیے سونے کی چڑیا تھی، اس چڑیا کو وہ کسی قیمت پر اپنے ہاتھ سے نکلنے دینا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن اسے اس گھر میں خورشید کا رہنا بھی پسند نہ تھا، لہٰذا اُس نے نادرہ کے فیصلے کو قبول کر لیا اور سوچنے لگا کہ آئندہ اس معاملے میں کس طرح نمٹا جائے کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔

خورشید رات کا کھانا کھا کر خدا بخش کے پاس ضرور جاتا، اُس کے کمرے میں بیٹھ کر وہ اُسے دن بھر کی باتیں سناتا، اُس سے دن بھر کی روداد سنتا اور پھر اپنے کمرے میں سونے کے لیے آ جاتا۔ آج بھی وہ رات کا کھانا کھا کر خدا بخش کے کمرے میں پہنچا، خدا بخش حسبِ معمول حقہ گڑگڑا رہا تھا، اُس نے اسے دیکھا، خورشید خاموشی سے ان کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

خدا بخش نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا، جب وہ نہ بولا تو وہ خود بولا "خورشید صاحب! خیر تو ہے آج آپ چپ چپ سے ہیں؟"

"دادا! انھیں معلوم ہے آج خالد صاحب کا باجی سے جھگڑا ہوا؟"

"اچھا! مجھے تو نہیں معلوم، مگر کس بات پر؟" خدا بخش نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"دادا! میری وجہ سے، وہ باجی کے باہر جانے پر ناراض تھے، مجھے اگرچہ باجی نے باہر جانے کا اشارہ کر دیا تھا لیکن میں نے دروازے کی اوٹ میں ہو کر ان کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ وہ مجھے اور آپ کو یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ دادا آخر وہ ہم سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں، ہم نے اُن کا کیا بگاڑا ہے، ہم یہاں خود تو نہیں آئے۔ ویسے باجی نے بھی انھیں خوب سنائیں۔"

"اچھا کیا کہا نادرہ بیٹی نے؟"

جواب میں خورشید نے نادرہ اور خالد کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا دیا، ساری باتیں سن کر دادا کے چہرے پر پریشانی آ گئی۔

وہ بولا "بیٹا! تو فکر نہ کر، چند دنوں کی بات اور ہے، خالد صاحب ٹھیک ہو جائیں گے، اگر وہ ٹھیک نہ ہوئے تو نادرہ بیٹی ٹھیک کر دے گی انھیں، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

خورشید کچھ دیر ان کے کمرے میں بیٹھ کر چلا آیا، اپنے بیڈ پر لیٹا تو اسے کچے مکان کی ٹوٹی چارپائی یاد آ گئی جس پر وہ لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا، آج فوم کے نرم ملائم گدے پر لیٹ کر وہ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا، نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

آج اسے نادرہ نے چڑیا گھر کی سیر کرائی تھی، وہاں وہ ہاتھی پر بیٹھا تھا، اسے نادرہ نے آئس کریم کھلائی تھی اور ناچتے ہوئے مور کے پنجرے کے سامنے کھڑے ہو کر پوچھا تھا۔

"خورشید! ایک بات تو بتاؤ۔"

"جی باجی پوچھیں، نہیں ٹھہریں پہلے میں سوال کروں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے کرو۔" نادرہ نے اجازت دی۔

"آپ پردہ تو نہیں کرتیں لیکن چڑیا گھر میں داخل ہونے سے پہلے آپ نے برقع کیوں پہن لیا؟"

"اس لیے کہ اگر میں برقع نہ اوڑھتی تو اس وقت مجھے دیکھنے کے شوق میں یہاں لوگوں کا ہجوم لگ چکا ہوتا پھر تو یہاں سے بھاگتے ہی بنتی، شہرت بھی کسی عذاب سے کم نہیں۔" نادرہ نے اداسی سے کہا۔

"اب آپ پوچھیں۔"

"ہاں، میں تم سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تمہیں میرے اداکارہ ہونے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" خورشید نے ہنستے ہوئے کہا "دادا کہتے ہیں کہ کسی عورت کا اداکارہ ہونا بُرا نہیں ہوتا، اداکاری آپ کا پیشہ ہے اور کوئی پیشہ بذاتِ خود بُرا نہیں ہوتا جب تک کہ اُسے خود بُرا نہ بنایا جائے۔"

یہ سن کر نادرہ نے وفورِ جذبات سے خورشید کی گردن میں باہیں ڈال کر اسے اپنے قریب کر لیا اور بولی "خورشید! اس عمر میں تم اتنی بڑی بڑی باتیں کیسے کر لیتے ہو، اللہ تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔"

"اللہ مجھے خالد صاحب کی نظر سے بچائے" اُس نے سوچا اور یہی سوچتے سوچتے جانے کب نیند آ گئی۔

وقت گزرتا رہا۔

خالد لاثانی نے خورشید کو اگرچہ دل سے تو قبول نہ کیا لیکن وہ اُس کا کچھ بگاڑ بھی نہ پایا، کوشش تو اس نے بہت کی کہ کسی طرح خورشید، نادرہ کے دل سے اتر جائے لیکن ہوا یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اور اُس کے دل میں گھر کر گیا۔

آٹھویں کا امتحان اُس نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا، وہ اپنی کلاس میں اوّل آیا، اسکول سے اوّل آنے پر انعام ملا، پھر نادرہ نے دیا، خدا بخش نے بھی اسے ایک اچھا سا تحفہ دیا، خدا بخش اُس کے اوّل آنے پر بہت خوش تھا، اس گھر میں رہتے ہوئے انھیں تقریباً تین سال ہو گئے تھے اور ان تین سالوں میں انھوں نے خوشی ہی خوشی دیکھی تھی، خدا بخش کی صحت پہلے سے اچھی ہو گئی تھی... لیکن...

ایک کانٹا اُس کے دل میں چبھا ہوا تھا۔

خدا بخش اب خورشید کی طرف سے تو بالکل مطمئن ہو گیا تھا لیکن اس کی ماں صابرہ بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہوں میں گھوم جاتی تھی، وہ جب گھر میں داخل ہوئی تھی تو اس نے اُسے بھکارن سمجھ کر دھتکار دیا تھا، تب اُس نے کتنی لجاجت سے کہا تھا۔

"ابا! تم نے پہچانا نہیں، میں تمہاری بدنصیب بیٹی ہوں، صابرہ۔"

صابرہ کا وہ چہرہ، خدا بخش آج تک نہ بھلا سکا، یہ چہرہ آج کل کچھ زیادہ ہی اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، بس ایک لمحے میں وہ سامنے آ جاتا، پھر گویا ایک فلم سی چل جاتی، یہ وہ ظلم یاد آ جاتے جو قربان نے اس کی بیٹی پر توڑے، اُسے وہ خون یاد آ جاتا جسے تھوکتے تھوکتے صابرہ اللہ کو پیاری ہو گئی تھی اور یہ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا، وہ آج تک خود کو معاف نہیں کر پایا تھا۔

ایک کانٹا اُس کے دل میں چبھا ہوا تھا۔

اُس نے خورشید کو ہمیشہ اس معاملے میں سمجھایا تھا، اُسے قربان سے سخت نفرت تھی، اتنی نفرت کہ وہ اُسے قتل کرنے کی سوچا کرتا تھا لیکن خدا بخش ہمیشہ اسے ٹھنڈا کر دیتا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ خورشید منتقم المزاج بن کر قاتل ہو جائے۔

یہ کام وہ خود کرنا چاہتا تھا، اپنے دل میں چبھا کانٹا وہ نکالنا چاہتا تھا۔

اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنے دل میں بھڑکتی آگ کو ٹھنڈا کرے، وہ خورشید کی طرف سے بالکل مطمئن تھا، ان تین سالوں میں اس نے نادرہ کے رویئے کو اچھی طرح آزما لیا تھا، نادرہ خورشید کے لیے شجرِ سایہ دار تھی، اب اسے دادا کی اتنی ضرورت نہیں رہی تھی۔

تب انھوں نے نادرہ سے بات کی "بیٹی میں کچھ دن کے لیے کراچی جانا چاہتا ہوں۔"

"ضرور جائیں، اچھا ہے آپ کی آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی۔"

نادرہ سے اجازت ملنے کے بعد انھوں نے خورشید کو بتایا "خورشید صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو ہم کراچی کی سیر کر آئیں؟"

"دادا! تم اکیلے جاؤ گے؟"

"ہاں تو اور کون جائے گا، اور تم تو تمہاری موجودگی نہیں" خدا بخش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہوا، دادا کا پوتا تو ہے۔"

"لیکن بیٹا تم کیسے جاؤ گے تمہارے اسکول کا حرج ہوگا، ابھی میں اکیلا ہو آتا ہوں پھر جب تمہاری چھٹیاں ہو جائیں گی تو دوبارہ چلیں گے، ٹھیک ہے؟"

"دادا کتنے دن میں واپس آؤ گے؟"

Pdf by Aswad Raza

"پندرہ بیس دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

"دادا! اتنے دن وہاں رہ کر کیا کرو گے؟ میں یہاں اکیلا بور ہوتا رہوں گا تمہارے بغیر۔"

"بیٹا! کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ میری بچپن سے خواہش تھی کہ کراچی دیکھوں لیکن حالات نے اجازت ہی نہیں دی۔ اب ذرا سکون ملا ہے تو سوچا ہوں اس موقع سے فائدہ اُٹھالوں۔ اتنے بڑے شہر کو دیکھنے کے لیے پندرہ بیس دن تو کچھ بھی نہیں پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ جلد لوٹ آؤں۔ تم بور کیسے ہو گے، تمہارے پاس تو نادرہ بیٹھی ہے، وہ تمہیں کہاں بور ہونے دے گی۔ بیٹا! کراچی جانا میرا ایک خواب ہے جو بڑے عرصے بعد شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے دادا! جاؤ کیجیے عیش کرو۔" خورشید نے خفگی سے کہا۔ "ہمارا کیا ہے، ہم لاہور میں ہی گھوم پھر کر خوش ہو لیں گے۔"

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں بیٹا کہ آدمی سمجھانا چاہتا ہے لیکن نہیں سمجھا سکتا۔ بتانا چاہتا ہے لیکن نہیں بتا سکتا۔ تم زندگی کو بھی ایسا ہی سمجھو جسے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ بیٹا! ایک بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں لیکن تم سوال نہ کرنا، جو کہوں اُسے خاموشی سے سُن لینا۔"

"ارے دادا! تم تو سنجیدہ ہو گئے، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا، تم کراچی جانا چاہتے ہو، ضرور جاؤ۔"

"بیٹا! کراچی یہاں سے بہت دُور ہے، ہو سکتا ہے ویسے مجھے اُمید ہے کہ ایسا ہو گا نہیں کہ میں لوٹ کر واپس نہ آسکوں، زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، بڑھاپا سر پہ بارش کی طرح برس رہا ہے۔ کون جانے یہ میرا آخری سفر ہو، تمہیں میری بس ایک ہی نصیحت ہے۔ اس گھر کو نہ چھوڑنا، نادرہ کی عزت کرنا، اُس کا سہارا بننا۔"

"دادا! تم نے یہ کیا بات چھیڑ دی، اُوپر سے سوال کرنے سے بھی منع کر دیا، تمھیں موت بھلے سے نہیں چھین سکتی، میں تمھارے لیے موت سے بھی ٹکرا جاؤں گا، تم مرنے جینے کی باتیں نہ کرو۔ ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے۔ تمھاری صحت بہت اچھی ہے اور تم کراچی گاڑی میں جاؤ گے، پیدل نہیں جاؤ گے۔ تم جاؤ، سیر کرو اور فوراً واپس آؤ۔" خورشید پیار سے بولا۔

"جو حکم سر۔" خدا بخش نے اُسے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔

پھر ایک دن خورشید اسکول سے واپس آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ خدا بخش کراچی چلے گئے ہیں۔ رات کو نادرہ شوٹنگ کر کے لوٹی تو خورشید نے اُسے خدا بخش کے بارے میں بتایا۔ "دادا خاموشی سے چلے گئے، بتا کر جاتے تو میں انھیں اسٹیشن تک چھوڑنے جاتا اور یہ بات بھلا وہ کہاں برداشت کرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے میرا اتنا سا بھی ٹائم برباد ہو۔ وہ تو بس ہر وقت میرے ہاتھ میں کتاب دیکھنا چاہتے ہیں۔"

حالانکہ یہ بات نہ تھی، انھیں اگر سیدھا کراچی جانا ہوتا تو وہ خورشید اور نادرہ کو ضرور بتا کر جاتے لیکن انھیں تو ابھی شیخو پورے جانا تھا۔

وہاں سے قربان کا پتا معلوم کرنا تھا۔

شیخو پورے میں خدا بخش کے دور پرے کے رشتے دار رہتے تھے، وہاں پہنچ کر اُس نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ خدا بخش کے جسم پر قیمتی کپڑے دیکھ کر انھوں نے اُس کی خوب آؤ بھگت کی۔ اُسے عزت سے ٹھہرایا لیکن وہ یہاں ٹھہرنے کے لیے نہیں آیا تھا، اُسے قربان کا پتا درکار تھا۔ اس کے ماں باپ سے خدا بخش نے اُس کا پتا حاصل کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ خدا بخش کراچی جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو اُس کی ماں نے جلدی جلدی کچھ کھانے پینے کی اشیاء بنا کر خدا بخش کے حوالے کر دیں۔ خدا بخش نے اُس پوٹلی کو اُٹھایا اور شام ہونے سے پہلے لاہور پہنچ گیا۔

پھر اُس نے وہاں سے ایک میل ٹرین پکڑی اور کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن رات کو گاڑی کراچی پہنچی۔ اُسے کینٹ اسٹیشن اُترنا تھا لیکن وہ عدم واقفیت کی وجہ سے سٹی اسٹیشن جا پہنچا۔ اُس کے پاس سامان زیادہ نہ تھا محض ایک سوٹ کیس تھا پھر وہ مختلف بسوں میں سفر کرتا بالآخر قربان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

قربان کورنگی کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے، اُس کے گھر پر تالا پڑا تھا۔ پڑوس کے ایک لڑکے نے بتایا "قربان ابھی تو گھر میں ہی تھے، شاید پان وان کھانے گئے ہوں گے، آپ یہیں ٹھہرے رہیں، میں انھیں دکان پر دیکھ کر آتا ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" خدا بخش نے سوٹ کیس دیوار سے لگا کر رکھا اور خود دروازے کی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

کوئی دس منٹ بعد وہ لڑکا قربان کو لے آیا۔ قربان نے خدا بخش کی شکل دیکھی تو اندر ہی اندر ڈر گیا۔ یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی، یہ اتنے عرصے بعد کہاں سے ٹپک پڑا، اسے میرا ایڈریس کیسے ملا؟ خیر! اِس کو پکڑ دینا پڑے گا، ڈرنے اور جھجکنے سے کام نہیں چلے گا۔

یہ سوچ کر اس نے فوراً پینترا بدلا اور لپک کر خدا بخش سے لپٹ گیا۔ "ارے چاچا! تم! ایمان سے تمھیں دیکھ کر بڑی خوشی ہو گئی، بہت عرصے کے بعد کسی اپنے کی صورت نظر آئی، ورنہ میں ہی لاہور اور شیخو پورے چلا جاؤں تو چلا جاؤں، ادھر سے کوئی نہیں پھٹکتا اور کوئی کیوں پھٹکے، یہ تو سب محبت کی بات ہے۔" پھر اُس نے مکان کا تالا کھولا۔ "آؤ چاچا! اندر آؤ۔"

خدا بخش خاموشی سے مکان کے اندر داخل ہوا، یہ ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان تھا۔

"چاچا! تم نے کھانا کھایا؟"

"ہاں، میں نے اسٹیشن پر کھا لیا تھا۔"

"کمال کیا چاچا، جب گھر آ رہے تھے تو اسٹیشن پر کھانا کھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ٹھیک بہت لگ رہی تھی، مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں کب تک تیرے گھر پہنچوں گا، اس لیے میں نے وہیں کھا لیا۔"

"چاچا! مکان ڈھونڈنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوئی؟"

"نہیں، ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے، تُو تو پھر قربان ہے، میرا مطلب ہے انسان ہے۔"

"میرا پتا تمھیں کیسے ملا؟"

"تمہارے گھر سے۔"

"شیخو پورے گئے تھے؟"

"ہاں گیا تھا، تیری ماں نے تجھے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھیجی ہیں، میں ابھی نکال کر دیتا ہوں۔"

"ہاں وہ دینا اور سناؤ لاہور کے کیا حال ہیں؟"

"لاہور کے یا صابرہ کے؟" خدا بخش نے بڑی معصومیت سے کہا۔

لیکن قربان کو ایسا لگا جیسے کہیں قریب ہی کوئی سانپ پھنکارا ہو۔

"ہاں صابرہ کیسی ہے؟" اُس نے جھجک کر سوال کیا۔

"اتنے عرصے کے بعد پوچھ رہا ہے، وہ کیسی ہے، تُو نے تو اُسے تانگے میں بٹھا کر پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ وہ کہاں گئی، وہ گھر بھی پہنچی ہے یا اُسے تانگے والا لے اُڑا۔"

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا، آج کون سا زمانہ جا رہا ہے، اب تو اپنوں کا بھروسا نہیں رہا اور تو ایک تانگے والے پر بھروسا کر بیٹھا۔ اپنی بیوی کو کبھی کوئی اس طرح چھوڑتا ہے لیکن تُو نے چھوڑ دیا کیونکہ تُو نے اُسے چھوڑنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جب کسی چیز میں آدمی کی دلچسپی ختم ہو جائے تو پھر وہ ایسا ہی کرتا ہے، اُس کی بلا سے وہ گھر پہنچے یا تانگے والا لے اُڑے۔"

"کیا ہوا چاچا! کیا صابرہ گھر نہیں پہنچی؟"

"گھر پہنچی تو مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوتا کہ تُو نے اُسے کہاں چھوڑا تھا لیکن وہ گھر جس حال میں پہنچی، اگر نہ پہنچتی تو اچھا ہوتا۔"

"تانگے والے نے کچھ......؟"

"نہیں، تانگے والے نے کچھ نہیں کیا، ہر تانگے والا بُرا نہیں ہوتا۔ اُس بے چارے نے تو بہ حفاظت گھر پہنچا دیا تھا لیکن جب وہ میرے گھر کے آنگن میں داخل ہوئی تو میں اُسے پہچان نہ سکا، وہ بہت شدید بیمار تھی، اس کی شکل بگڑ گئی تھی، اُس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا، اُس کے تن پر جو لباس تھا وہ غریبوں والا نہ تھا، بھکاریوں والا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب وہ میرے گھر میں داخل ہوئی تو میں نے اُسے بھکارن سمجھ کر دھتکار دیا، تب اُس نے دُکھ بھری آواز میں کہا، ابا! میں بھکارن نہیں، تمھاری بدنصیب بہو ہوں۔" خدا بخش یہ کہہ کر اپنے آنسو نہ ضبط کر سکا، وہ اپنے بازوؤں میں مُنہ چھپا کر سسک سسک کر رو پڑا۔

قربان کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ قربان کے ذہن میں ابھی وہ سب ظلم تازہ ہو گئے تھے جو اُس نے صابرہ پر توڑے تھے۔ ایک بیوی کی اس سے زیادہ تذلیل کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کا شوہر اُسے غلط راہوں پر چلنے کے لیے مجبور کرے۔ وہ پانچ سال جو صابرہ نے اُس کے ساتھ گزارے، وہ دن بن کر اُس کے سامنے اکٹھا ہو گئے تھے، یہ دن ایک جمِ غفیر کی صورت میں اُس کے سامنے کھڑے اُس سے صابرہ کا حساب مانگ رہے تھے۔

اُسے نہیں معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ اُس سے اُس کے ظلم کا حساب کیا جائے گا۔ اُس نے جانے کتنی عورتوں کو بیوی بنا کر گناہ کے راستے پر ڈال دیا تھا، یہ حرام کی کمائی ہی اُس کی آمدنی کا ذریعہ تھی۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اُس کے گھر میں کچھ نہ تھا، گھر میں کوئی عورت نہ تھی، بچے نہ تھے۔ کوئی قابلِ ذکر سامان نہ تھا، کوئی اچھی رہائش نہ تھی، بصورت پر پھٹکار برس رہی تھی لیکن اب بھی اُس کے وہی شب و روز تھے۔

○ "ویٹر! یہ شوربہ کسی گدھے تک کے لیے موزوں نہیں ہے۔"
"مجھے افسوس ہے جناب! میں ابھی ایسا شوربہ لاتا ہوں جو موزوں ہو۔"

○ "ویٹر! تم نے اپنی گندی اُنگلیاں میرے شوربے میں ڈبو دیں۔"
"پریشان نہ ہوں جناب! شوربہ اتنا گرم نہیں ہے کہ اُنگلیاں جل جائیں۔"

○ "ویٹر! یہ انڈا تازہ نہیں ہے۔"
"میرا کوئی قصور نہیں ہے جناب! یہ انڈا باورچی نے دیا ہے۔"

○ "ویٹر! شوربے کا گوشت بڑا سخت ہے۔"
"گوشت ٹھیک ہے جناب! چھری میں دھار نہیں ہے۔"

○ ویٹر! کیا تم گدھے بھی کھلاتے ہو؟"
"تشریف رکھیے جناب! ہم سبھی کو کھلاتے ہیں۔"

○ "ویٹر! اس کافی کا ذائقہ تارپین کے تیل جیسا ہے۔"
"شاید آپ کو چائے پیش کر دی گئی ہے جناب، ہماری کافی کا ذائقہ سڑے ہوئے گوشت جیسا ہوتا ہے۔"

○ ویٹر! یہ روٹی ہے یا پاپڑ؟"
"ڈبل روٹی ہے جناب۔"

○ "اس ڈش کا کیا نام ہے ویٹر؟"
"ابھی اس کا نام زیرِ غور ہے جناب، مناسب نام بتانے والے کو انعام دیا جائے گا، آپ بھی کوشش کر دیکھیے۔"

"چاچا، دوست!" قربان نے خدا بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اپنا ہاتھ پرے رکھو۔ یہ ہاتھ خونی ہیں۔ ان ہاتھوں پر میری صابرہ کا خون لگا ہے۔"

یہ سُن کر قربان کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ صابرہ مرگئی پھر اسے خیال آیا کہ اگر صابرہ مرنے والی نہ ہوتی تو وہ اُسے لاہور چھوڑ کر کیوں آتا۔ وہ مرنے والی تھی، وہ خون تھوک رہی تھی، شوکت کا کانٹا ہو گئی تھی، اس کی ہڈیوں میں دم نہ رہا تھا۔ اسی لیے تو وہ اُسے لاہور پھینک آیا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک اُمید موہوم کے تحت ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "اب صابرہ کہاں ہے؟"

"وہ اوپر چلی گئی۔" خدا بخش نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور اس کے قاتل تم ہو۔"

"میں، چاچا... میں... وہ کیسے؟"

"میں نے اپنی بہو تمھارے حوالے اس لیے نہیں کی تھی کہ تم اسے بری راہ پر لگانے کے لیے اس کا مار مار کے جسم چھلنی کر دو۔ تم نے میری معصوم بہو کی روح تک چھلنی کر دی۔ تم نے اس پر وہ ظلم کیے جو کبھی کسی شوہر نے کسی بیوی پر نہ کیے ہوں گے۔ تم نے تو اُسے اچھی طرح رکھنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ میں نے تم پر بھروسا کر کے اسے اتنی دور بھیج دیا۔ کتنی غلطی کی میں نے۔ پھر اس کو پلٹ کر بھی نہیں پوچھا۔ یہ اور بڑی غلطی کی میں نے۔"

"چاچا، اب تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تم سے پوچھنے کہ تم نے میری بہو پر یہ ظلم کیوں کیے۔ کیا بگاڑا تھا اس نے تمھارا؟"

"چاچا، میں نے اُس پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اُس نے تم سے جو کچھ کہا جھوٹ کہا۔ میں ایسا آدمی ہوں بھلا؟"

"اُس پر جو ظلم ہوئے اس کے لیے مجھے کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ مرنے والی کی حالت، اُس کا چہرہ اس بات کا گواہ تھا کہ اس پر یہاں کیا ظلم ہوا۔ رہ گئی یہ بات کہ تم کیسے آدمی ہو تو یہ بات میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کیسے آدمی ہو۔ افسوس اس بات کا ہے کہ کاش یہ سب کچھ مجھے پہلے معلوم ہو گیا ہوتا۔"

"اچھا، چلو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ میں بہت بُرا آدمی ہوں۔"

"پھر یہ بھی اقرار کرو کہ تمھاری بدسلوکی نے صابرہ کو مار دیا۔"

"نافرمانی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ میں اُس کا شوہر تھا۔ اُسے میرا حکم ماننا چاہیے تھا۔" قربان نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ "اچھا یہ سب چھوڑو۔ تم اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔"

"ہاں، اب تو سب چھوڑنا ہی پڑے گا۔ میں تمھارا بھلا بگاڑ کیا سکتا ہوں۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم کہاں کہ تم سے ٹکرا سکوں۔ ویسے میں تم سے ٹکرانے نہیں آیا۔ میں تو کراچی کام کی تلاش میں آیا ہوں۔" خدا بخش نے پینترا بدلا۔ اُس نے جو کچھ کرنا تھا، وہ اپنی جگہ طے تھا۔ وہ قربان کو چونکانا نہیں چاہتا تھا، اُسے ہوشیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ "یوں بھی رہنے کا ٹھکانہ چاہیے تھا۔"

"ارے تو یوں بولونا، چاچا۔ آتے ہی مجھے دھمکانا شروع کر دیا۔ میں دھمکائے بغیر بھی تمھیں رہنے کی جگہ دے دوں گا لیکن زیادہ دن نہیں، کام ملتے ہی تمھیں اپنے لیے رہنے کا ٹھکانہ ڈھونڈنا ہوگا۔" قربان نے ایک پُرسکون سانس کھینچ کر کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے قربان، جیسے ہی مجھے کام مل جائے گا، میں فوراً اپنا بندوبست کر لوں گا۔" خدا بخش نے کہا۔

"اب ماں نے کیا بھیجا ہے، وہ مجھے دکھا دو۔" قربان نے اطمینان سے چارپائی پر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر خدا بخش نے سوٹ کیس کھولا۔

قربان نے بڑی گہری نظر سے سوٹ کیس کے اندر کا جائزہ لیا۔ سوٹ کیس میں پہننے اوڑھنے کے کپڑوں کے علاوہ لکڑی کا ایک صندوقچہ بھی تھا۔ اس صندوقچے کو خدا بخش نے چھپانے کی کوشش کی۔ اُسے معلوم تھا کہ قربان کی نظریں اس وقت سوٹ کیس کی طرف ہیں۔ صندوقچے پر اپنی قمیص ڈالتے ہوئے کپڑوں میں سے ایک پوٹلی نکالی اور قربان کے حوالے کر دی۔ اس صندوقچے کو دیکھ کر قربان کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ اس میں رقم ہے۔ اگر رقم نہ ہوتی تو خدا بخش اُسے چھپانے کی کوشش نہ کرتا۔

خدا بخش اس وقت آٹھ سال پہلے والا خدا بخش نہ تھا۔ اس کے تن پر اچھے کپڑے تھے۔ ٹین کے بکس کے بجائے سوٹ کیس تھا اور سوٹ کیس کے اندر بھی جو کچھ تھا وہ بتا رہا تھا کہ خدا بخش اپنی پوری زندگی کا جمع جوڑ سمیٹ کر قربان کے پاس آگیا ہے۔ خدا بخش بھی کتنا سیدھا ہے۔ پہلے اُس نے اپنے بھولپن میں صابرہ کو اس کے حوالے کیا اور اب خود کٹنے چلا آیا ہے۔

اس صندوقچے میں اس کے اندازے کے مطابق اچھی خاصی رقم ہوگی۔ اب اس نے سوچنا شروع کیا۔ کیا ہو سکتا ہے، کیا کیا جا سکتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ رات کو کوئی چور آ جائے، سوٹ کیس اٹھا کر چلتا بنے اور وہ دونوں سوتے رہ جائیں۔ ہاں یہی ٹھیک رہے گا لیکن وہ رات کو سوٹ کیس لے کر کہاں جائے گا اور اسے کہاں چھپائے گا۔ گھر میں تو سوٹ کیس چھپانے کی جگہ نہ تھی۔ اچھا، خیر کچھ اور سوچتے ہیں۔ ابھی چاچا کو سونے دو۔

قربان نے وہ پوٹلی کھولی۔ ماں نے پنیری میٹھی روٹیاں اور سوجی کا خشک حلوا بھیجا تھا۔

خدا بخش نے سوٹ کیس بند کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لی اور سوٹ کیس چارپائی کے نیچے کھسکا دیا۔ پھر وہ خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

قربان باورچی خانے سے ایک بڑی پلیٹ اٹھا لایا۔ اس نے ماں کی بھجوائی ہوئی سوغات میں سے تھوڑی تھوڑی ساری چیزیں پلیٹ میں نکالیں اور خدا بخش کے سامنے پلیٹ کھسکاتے ہوئے بڑے پیار سے بولا۔ "لو چاچا، کھاؤ۔"

خدا بخش نے میٹھی روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا۔ اگرچہ یہ دو دن کی باسی روٹی تھی لیکن ابھی اس کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ بلکہ خستگی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ مزے لے کر کھانے لگا۔

پھر قربان نے چائے بنائی۔ چائے بناتے ہوئے سوچنے لگا کہ وہ کیمسٹ کے ہاں سے نیند کی ایک گولی لے آئے۔ اُسے چائے میں ملا کر خدا بخش کو دے دے۔ یہ اطمینان سے سوتا رہے گا اور وہ اس کی جیب سے چابی نکال کر سکون سے سوٹ کیس کی تلاشی لے گا۔ نہ، گولی دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ تھک کر چور ہو رہا ہوگا۔ ابھی لیٹے گا تو پھر صبح تک کروٹ بھی نہیں لے گا۔

خدا بخش نے چائے پینے کے بعد لیٹنے کی خواہش ظاہر کی۔ "اتنا لمبا سفر میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔ تھک کر چور ہو رہا ہوں۔ لیٹنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، چاچا، اب تم لیٹ جاؤ۔ میں تمھارے لیے بستر کیے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر قربان نے دوسری چارپائی پر خدا بخش کے لیے بستر بچھا دیا۔

"کیا بجا ہے؟" خدا بخش نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"گیارہ بجے ہیں۔" قربان نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم صبح کتنے بجے اُٹھتے ہو؟"

"میں کہاں اُٹھتا ہوں، صبح جمعدار آ کر اٹھاتا ہے۔"

"اچھا۔" خدا بخش نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تو صبح فجر کے وقت اُٹھوں گا۔"

"چاچا، خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرنا، کہیں مجھے نہ اٹھا دینا۔" قربان نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"اچھا، ٹھیک ہے، تمھیں نہیں اُٹھاؤں گا۔" خدا بخش نے کہا۔ "یہاں مسجد کہاں ہے؟"

"مسجد نزدیک ہی ہے۔ گلی سے نکل کر بائیں ہاتھ مڑ جانا پھر میدان پار کر کے سیدھے ہاتھ کو چل پڑنا۔ مسجد کا مینار تمھیں نظر آجائے گا۔" قربان نے بتایا۔

"یہاں چوریاں تو نہیں ہوتیں؟" خدا بخش نے کچھ سوچ کر سوال کیا۔

"چوریاں تو یہاں بہت ہوتی ہیں۔ ابھی کل ہی پڑوس میں چوری ہوئی ہے۔" اس نے بھی کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"اچھا، پھر تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"کیوں، کیا مشکل ہو جائے گی؟"

"اب تم سے کیا چھپانا، میرے سوٹ کیس میں، میری زندگی بھر کی کمائی موجود ہے جو میں نے پائی پائی کر کے جوڑی ہے۔"

"تمھارے سوٹ کیس میں جو چھوٹا سا صندوقچہ ہے، اُس میں ہے رقم؟" قربان نے کہا۔

"ہاں، اُسی میں ہے۔" خدا بخش نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس گھر میں تو چوری کے امکانات نہیں، یہاں رکھا ہی کیا ہے۔ پھر بھی احتیاطاً تم یوں کرو کہ سوٹ کیس سے صندوقچہ نکال لو۔" قربان نے تجویز پیش کی۔

"اُسے کہاں رکھو گے؟" خدا بخش نے پوچھا۔

"میں اُسے باورچی خانے میں آٹے کے کنستر میں رکھ دیتا ہوں۔ رات ہی کی تو بات ہے۔ صبح جا کر رقم بینک میں ڈال دینا۔" قربان کی زبان پر ایک سوال آتے آتے رہ گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنی زبان کو تالو میں کیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ صندوقچے میں رقم کتنی ہے۔ یہ ایک غیر ضروری سوال تھا۔ اس سوال سے رقم میں اُس کی دلچسپی ظاہر ہو جاتی جو وہ چاہتا نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ دو ڈھائی گھنٹے بعد صندوقچہ اُس کے سامنے کھلا ہوگا اور وہ آرام سے رقم گن رہا ہوگا۔ پھر وہ عجلت پسندی سے کام لے کر رقم میں اپنی دلچسپی کیوں ظاہر کرے۔ یہ سوال تو وہ رقم کے چوری ہونے کے بعد کرے گا۔

"ہاں، یہ ترکیب بہت اچھی ہے، باورچی خانے میں رقم محفوظ رہے گی۔ ظاہر ہے چور آٹے کا کنستر تو دیکھنے سے رہا۔" خدا بخش یہ کہہ کر اُٹھا۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے سوٹ کیس کھینچ کر نکالا۔ اُسے کھولا۔ پھر اس میں سے صندوقچہ نکالا۔ اس چھوٹے سے لکڑی کے صندوقچے میں ایک چھوٹا سا تالا پڑا تھا۔ یہ تالا ہاتھ کے ایک جھٹکے سے کھل سکتا تھا۔ خدا بخش نے وہ صندوقچہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو قربان، جا کر رکھ دو۔"

"نہیں چاچا، یہ صندوقچہ تم اپنے ہاتھ سے کنستر میں رکھو تو اچھا ہے۔"

خدا بخش بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے ہی صندوقچہ کنستر میں رکھے تو بہتر ہوگا۔ اُس نے قربان کی طرف دیکھتے ہوئے

Pdf by Aswad Raza

کہا: "اچھا، ٹھیک ہے، میں رکھ دیتا ہوں۔"

پھر خدا بخش نے باورچی خانے میں جا کر آٹے کے کنستر میں اس صندوقچے کو رکھ دیا۔ کنستر میں تھوڑا سا آٹا تھا۔ کنستر بند کر کے خدا بخش بولا: "کنستر میں تالا لگا دوں؟"

"نہیں چاچا، اس میں تالا لگایا تو چور کھٹک جائے گا۔ وہ آٹے کے کنستر میں تالا لگا دیکھے گا تو سوچے گا کہ مال میں ضرور کالا ہے۔"

"ہاں، یہ بات بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ایسے ہی رہنے دو۔ اللہ مالک ہے۔"

پھر وہ دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔

قربان بڑی بے قراری سے خدا بخش کے سونے کا منتظر تھا۔ اور خدا بخش اس بات سے آگاہ تھا کہ وہ جیسے ہی یہ محسوس کرے گا کہ وہ سو گیا ہے، وہ فوراً باورچی خانے کا رُخ کرے گا۔ باورچی خانے میں پہنچ کر وہ بہت احتیاط سے صندوقچہ نکالے گا، جھٹکا مار کر تالا کھولے گا۔ اور پھر بڑی بے قراری سے صندوقچے کا ڈھکنا اُٹھائے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا، یہ بات خدا بخش کو اچھی طرح معلوم تھی۔ اُس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ جب قربان باورچی خانے میں ہوگا تو اُسے اُٹھ کر کیا کرنا ہوگا۔

قربان کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ یہ بڈھا جلد از جلد گہری نیند میں چلا جائے۔ پھر وہ اُٹھے۔ صندوقچے سے رقم نکالے۔ اُسے گھر میں کہیں چھپا دے اور پھر چھپانے کے بعد "چور، چور" کی آواز لگائے۔ خدا بخش اُٹھے تو وہ اُس کے ساتھ گلی میں جائے۔ جیسے چور ابھی بھاگا ہو۔ "چور، چور" کی آوازیں سُن کر محلے والے بھی اُٹھ جائیں گے۔ اس طرح وہ انہیں چور کی آمد کی داستان سُنا کر خدا بخش کو رقم چوری ہونے کا یقین دلا دے گا۔ اُدھر خدا بخش سوچ رہا تھا کہ آج قربان کا یوم حساب ہے۔ آج وہ اُسے ایسا سبق سکھائے گا کہ آئندہ وہ اس قابل نہ رہے گا کہ کسی پر ظلم کر سکے۔ اور قربان سوچ رہا تھا کہ آج اس گھر پر اس بڈھے کی پہلی اور آخری رات ہے۔ کل وہ کسی قابل نہ رہے گا۔ اس کا سب کچھ لُٹ جائے گا۔ آئندہ پھر کبھی وہ اپنی زندگی بھر کی کمائی اپنے ساتھ لے پھرنے کا حوصلہ نہ کرے گا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد خدا بخش نے سونے کی اداکاری شروع کی۔ اُس نے پہلے آہستہ، پھر زور زور سے خراٹے لینے شروع کیے۔ یہ خراٹے، یہ ظاہر کر رہے تھے کہ خدا بخش آج کچھ اس طرح سویا ہے کہ اب دو تین دن کے بعد اُٹھے گا۔

قربان نے چار پانچ منٹ مزید انتظار کیا۔ خدا بخش کے خراٹوں کا تسلسل برقرار رہا۔ پھر وہ اُٹھا۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے بارہ بجے تھے۔ یہ وقت چوروں کے آنے کا نہ تھا۔ چور تو رات کے آخری پہر میں چوری کی غرض سے نکلتے ہیں، اس وقت مکینوں کی نیند گہری ہوتی ہے۔ اُس نے سوچا، ابھی چوری کا ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں۔ فی الحال باورچی خانے میں جا کر یہ رقم دیکھنا چاہیے کہ کتنی ہے۔ پھر دو ڈھائی گھنٹے بعد "چور، چور" کی آوازیں لگا کر اس رقم کو ہڑپ کرنا مناسب ہوگا۔

قربان دبے پاؤں کمرے سے نکل کر باورچی خانے میں پہنچا۔ لائٹ جلا کر اُس نے دروازہ بند کر دیا۔ دروازے میں اندر کی طرف کوئی کھڑکی نہ تھی لہٰذا وہ اُسے بولٹ نہ کر سکا۔ پھر اُس نے آہستہ سے کنستر کا ڈھکنا کھولا۔ ڈھکنا کھولنے سے آواز پیدا ہوئی۔ قربان نے کمرے کی طرف کان لگائے۔ باہر کوئی آہٹ نہ تھی۔ خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ پھر قربان نے صندوقچہ نکالا۔ صندوقچے کے تالے کو ہلکا سا کھینچا، وہ چھوٹا سا کھٹکے والا تالا تھا، فوراً کھل گیا۔ اُسے اُس پر زور آزمائی کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ شاید وہ تالا خراب تھا اور اُسے ایسے ہی رُعب دینے کے لیے صندوقچے میں ڈال دیا گیا تھا۔

قربان کے کمرے سے نکلتے ہی خدا بخش نے اپنی آنکھیں نیم وا کر لیں لیکن خراٹے بدستور جاری رکھے۔ اُس نے باورچی خانے کا دروازہ کھلنے پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر کنستر کھلنے کی آواز آئی۔ کنستر کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ خدا بخش نے کمرے کے ایک کونے میں کھڑی ہاکی اسٹک کو اُٹھایا اور دروازے پر آ گیا۔

قربان نے تلاش بھری نظروں سے صندوقچے کا ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا تو اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ صندوقچے میں کوئی رقم نہ تھی۔ کوئی دولت نہ تھی۔ البتہ ایک ناگ صندوقچے کا ڈھکنا اُٹھتے ہی پھن پھیلائے موجود تھا۔ جو دو دن سے بھوکا تھا۔ قربان نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن دروازہ بند تھا۔ اُسے کھولنے کے لیے صندوقچے کے قریب جانا پڑتا۔ قربان کے اُٹھتے ہی کالے ناگ نے اُس کے پیر پر پھن مارا۔ اور بڑی تیزی سے اُس کی پنڈلی سے لپٹ گیا۔ وہ بھوکا تو تھا ہی۔ اُس نے غصے میں، اس کے جسم میں اپنے دانت گاڑ دیے اور زہر کی پوری پوٹلی اُس کی رگوں میں اتار دی۔

قربان کا آدھا دام تو اُسے دیکھ کر ہی نکل گیا تھا، آدھا دام اُس کے کاٹتے ہی نکل گیا۔ قربان کی بس خوف سے گھگھیائی ہوئی ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر اندر خاموشی چھا گئی۔

خدا بخش نے اسٹک سے دروازے کو دھکا دیا۔ لیکن وہ تھوڑا کھل کر رہ گیا۔ اُس کے پیچھے قربان کی لاش موجود تھی۔

دروازہ تھوڑا سا کھلا تو اُس ناگ نے قربان کا جسم چھوڑ کر باہر کا رُخ کیا۔ خدا بخش ہوشیار تھا۔ ناگ نے جیسے ہی دروازے سے مُنہ نکالا، خدا بخش نے ایک بھرپور وار کیا۔ اسٹک سے اس کا پھن کچلا گیا۔ پھر خدا بخش نے مزید دو وار کر کے اُسے بالکل ٹھنڈا کر دیا۔

ناگ سے مطمئن ہو کر اُس نے دروازے کو اندر دھکیلا۔ اب دروازہ اتنا کھل چکا تھا کہ وہ اندر جا سکے۔ خدا بخش نے اندر داخل ہو کر قربان کو دیکھا۔ اس کے مُنہ سے جھاگ جاری تھا۔ جسم نیلا پڑ چکا تھا۔

خدا بخش نے اپنا صندوقچہ اُٹھایا۔ اُسے بند کیا۔ اُس میں تالا ڈالا اور اُسے لے کر باہر آ گیا۔ پھر اُس نے اس صندوقچے کو صاف کر کے اس میں قربان کی ماں کی بھیجی ہوئی کھانے پینے کی اشیا بھر دیں اور صندوقچہ کمرے کی الماری میں رکھ دیا۔

اُس کے بعد خدا بخش نے کمرے کی بتی بجھائی اور پورے اطمینان سے سو گیا۔

صبح اذانوں کے وقت اُس کی آنکھ کھلی۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔ پھر اُس نے دروازہ کھول کر گلی میں جھانکا۔ گلی میں پُرہیبت سناٹا طاری تھا۔ پوری گلی میں کسی کے گھر کی بتی روشن نہ ہوئی اور نہ ہی کسی کے گھر کا دروازہ کھلا۔ تب خدا بخش نے ہمت کر کے پڑوس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تاکہ گھر میں ہونے والی واردات سے پڑوسیوں کو آگاہ کر سکے۔

کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد کسی مرد کی آواز سنائی دی: "کون ہے بھئی؟"

"بھائی، دروازہ کھولیں، میری بات سُنیں۔" خدا بخش نے زور سے کہا۔

"تم ہو کون؟"

"میں قربان کا چاچا ہوں، خدا بخش۔ بھائی صاحب، ذرا باہر آ کر میری بات سُن لیں۔"

"ارے، صبح ہی صبح کس لعنتی کا نام لے دیا۔ ویسے تمہیں پریشانی کیا ہے؟"

"بھائی صاحب، دروازہ تو کھولیں۔"

"اجی، دروازہ مت کھولنا، پتا نہیں کون ہے۔" اس مرتبہ کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

"بھائی صاحب، آپ میری مدد کریں، قربان کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔"

"قربان کو سانپ نے کاٹ لیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ تو خود سانپ ہے، اُس نے اس گلی کے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔" اندر سے بڑی غصیلی آواز آئی۔

"بھائی صاحب، اب وہ آئندہ کسی کا جینا حرام نہیں کر سکے گا۔"

"کیوں، کیا ہوا، کیا مر گیا وہ؟" مرد نے پوچھا۔

"ارے شبّو کے ابا! کیسی بات کرتے ہو، وہ کمبخت کہاں مرنے والا، اُسے موت کہاں۔" عورت نے کہا۔

"نہیں جی، وہ مر گیا ہے، یہی اطلاع دینے میں آیا تھا۔" خدا بخش نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔ "گھر میں اُس کی لاش پڑی ہے۔"

"ارے اللہ، تیرا لاکھ لاکھ شکر کہ تو نے اُس کے لیے اوپر سے عذاب بھیج دیا، ورنہ اس گلی میں تو اُس کو مارنے والا کوئی نہ تھا۔" دن کا اُجالا پھیلتے پھیلتے قربان کی موت کی اطلاع پوری گلی میں پھیل گئی۔ جس نے بھی سنا، اُس کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔ وہ خوشی خوشی اُس کی لاش دیکھنے آیا اور دیکھ کر چلا گیا۔ کسی ایک نے بھی تو اُس کی موت کی خبر سُن کر تاسف کا اظہار نہیں کیا۔

یہ جان کر خدا بخش کو مزید خوشی ہوئی۔ اُس نے ایک ایسے موذی کو مار دیا تھا جس نے اللہ کی مخلوق کو محض آزار پہنچانے کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔

پورے محلے میں ایک بھی آدمی اُس کی تجہیز و تکفین کے لیے راضی نہ ہوا اور یہ بھی عذاب الٰہی تھا۔

مرنے کے بعد آدمی خالی ہاتھ اوپر جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے اپنا اخلاق چھوڑ جاتا ہے۔ موت کے بعد آدمی کی صحیح مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا ہو گیا تھا۔ اس کی مقبولیت کی بات تو بہت دور کی ہے۔ کوئی اُسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

خدا بخش کی اتنی عمر گزر گئی تھی، اُس نے اپنی زندگی میں جانے کتنے جنازے دیکھے تھے لیکن ایسا جنازہ اُس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لوگ اُس کی موت کی خبر سُن کر خوش ہو رہے تھے۔ لوگ آتے، اُس کی لاش کو دیکھتے۔ مرے ہوئے سانپ کا معائنہ کرتے اور عذاب الٰہی کا ذکر کرتے رخصت ہو جاتے۔

اس طرح صبح سے شام ہو گئی۔ لیکن مسئلے کا حل نہ نکلا۔ پھر محلے کے کسی آدمی نے خدا بخش کی پریشانی کا خیال کرتے ہوئے اُسے مشورہ دیا: "اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بھتیجے کا کفن دفن ہو جائے تو تھانے چلے جائیں۔"

"بھائی صاحب، پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ میرا بھتیجا نہیں ہے۔ اللہ نہ کرے، ایسا بھتیجا کسی کا ہو۔ میں اس کے پاس محض کام کی تلاش میں آیا تھا۔"

"معاف کرنا۔" اُس شخص نے فوراً معذرت کی۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپ اپنی شکل و صورت سے کوئی اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اب آپ کے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ اپنا سامان اُٹھائیں اور جہاں سے آئے ہیں، فوراً واپس چلے جائیں۔ اس لاش کی پروا نہ کریں، پولیس

Pdf by Aswad Raza

یا کوئی رفاہی ادارہ اس لاش کو ٹھکانے لگا دے گا۔"

"چلیں، پھر تھانے چلیں۔" خدا بخش نے اس شخص سے کہا۔ "چل کر پولیس کو اطلاع دے دیتے ہیں۔"

"نا بابا، مجھے تو معاف کرو، پولیس والوں سے اللہ بچائے، تم اکیلے ہی جاؤ بلکہ نہ جاؤ تو زیادہ اچھا ہے، میرا خیال ہے تم یہاں سے بھاگ جاؤ تو اچھا ہے۔"

لیکن خدا بخش بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں کسی وجہ سے اس کی شخصیت مشکوک ہو جائے اور پولیس اس کی تلاش میں لگ جائے۔ یہی سوچ کر اس نے گلی والوں کے دروازے کھٹکھٹائے تھے تاکہ وہ سب کے سامنے آ جائے۔

پھر خدا بخش نے خود ہی تھانے جا کر اطلاع کی۔ تھانے والے قربان کا نام سن کر کوئی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ اس نے خدا بخش کو کئی گھنٹے تک تھانے میں بٹھائے رکھا۔ رات کے آٹھ بجے اس نے ایک پولیس مین کو اس کے ساتھ کیا۔ گھر پہنچنے کے آدھے گھنٹے کے بعد ایک رفاہی ادارے کی ایمبولینس آ گئی۔ پولیس والے نے خدا بخش کی مدد سے اس کی لاش گاڑی میں رکھی اور خود بھی ایمبولینس میں بیٹھ کر چلا گیا۔

لاش اٹھ جانے کے بعد گلی والوں نے سکھ کا سانس لیا۔ سکھ کا سانس تو خدا بخش نے بھی لیا تھا۔ لیکن کوئی اس سکون بھرے سانس کو محسوس نہ کر پایا۔

اب خدا بخش کا اس گھر میں مزید رہنا بے کار تھا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اسٹیشن کی راہ لی۔ اور وہاں سے لاہور کے لیے جو پہلی گاڑی ملی، اس میں سوار ہو گیا۔

پانچویں دن رات کو جب خدا بخش گھر پہنچا تو خورشید اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ "ارے دادا، تم اتنی جلدی واپس آ گئے۔"

"ہاں بیٹا، میں وہاں بس ایک ہی دن رہا۔ تیرے بغیر جی ہی نہ لگا۔ اس لیے فوراً واپس آ گیا۔"

"سچ دادا۔" خورشید خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نہ کہتا تھا، اکیلے مت جاؤ، اب دیکھ لیا۔ واپس آنا پڑا۔"

"نادرہ بیٹی کہاں ہے؟" خدا بخش نے پوچھا۔

"اسٹوڈیو سے ابھی واپس نہیں آئیں۔"

"اور وہ نادر شاہ کہاں ہیں؟"

"نادر شاہ بھی باجی کے ساتھ ہیں۔" خورشید نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا جی خورشید صاحب، ہمیں بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ تھکن بھی ہے اور پورے جسم پر گرد بھی جمی ہے۔"

"تو دادا، پہلے تم نہا لو، پھر کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد گرم گرم چائے پیو، حقہ گڑگڑاؤ اور سو جاؤ۔"

ویسے خدا بخش کے مستقل سونے کے دن قریب آ چکے تھے۔ کراچی سے واپس آنے کے بعد وہ صرف تین دن اور زندہ رہا۔ قربان سے انتقام لینے کے بعد جیسے اسے قرار سا آ گیا تھا۔ اب جینے کی خواہش نہ رہی تھی۔

ان تین دنوں میں، اس نے پل پل خورشید کے ساتھ گزارا۔ اگر نادرہ نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے اسے روک دیا۔ "بیٹی، آج نہیں، کل لے جانا۔ میرا جی چاہتا ہے، یہ میری نظروں کے سامنے رہے۔"

نادرہ نے یہ پوچھے بغیر کہ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے، اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔

خورشید بس اسکول ضرور جاتا تھا۔ خدا بخش کا بس چلتا تو اس کے ساتھ کلاس میں بھی جا بیٹھتا۔ خدا بخش نے اتنا ضرور کیا تھا کہ وہ گاڑی میں خود بھی اسے اسکول چھوڑنے جانے لگا تھا۔ واپسی پر بھی وہ اسے لینے پہنچ جاتا۔ پھر وہ گھر میں اس کے سامنے رہتا۔

نادرہ نے خدا بخش کی بڑھتی ہوئی دیوانگی کو محسوس کیا تھا، لیکن اسے ٹوکا نہیں تھا۔ وہ اسے ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔ خورشید خود اپنے دادا کا دیوانہ تھا۔

تیسرے دن کی شام کو خدا بخش کو بخار ہوا۔ نادرہ کو معلوم ہوا تو اس نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کر دیا اور خود شوٹنگ چھوڑ کر گھر آ گئی۔ ان تین سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ خدا بخش بیمار ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور کہا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں، فلو کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے، کل تک ٹھیک ہو جائیں گے۔"

لیکن ٹھیک ہونے والی کل کبھی نہ آئی۔

خورشید نے اپنے ہاتھ سے خدا بخش کو دوائیں پلائیں۔ نادرہ بھی کچھ دیر خدا بخش کے کمرے میں رہی۔ پھر کچھ مہمان آ گئے تو وہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ نادرہ کے جانے کے بعد خدا بخش بولا۔ "خورشید!"

"جی دادا!"

"بیٹا کل رات کو میں نے تیری ماں کو خواب میں دیکھا تھا۔"

"اچھا دادا، وہ کیا کر رہی تھیں؟"

"بیٹا، وہ بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور بہت خوش تھی۔"

"دادا، میری تو حسرت ہی رہی کہ میں اپنی ماں کو اچھے لباس میں ہنستا مسکراتا دیکھوں۔"

"بیٹا، جانتے ہو وہ کیوں خوش تھی؟"

"نہیں دادا۔"

"بیٹا، وہ اس موذی کے مرنے کی وجہ سے خوش تھی۔"

"کون موذی، دادا، میں سمجھا نہیں۔"

"ارے، وہ قربان، جس نے تیری ماں کو بہت دکھ دیے۔"

"وہ مر گیا دادا، اسے تو میں نے مارنا تھا، میں تو اپنے بڑے ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔"

"اسے میں نے مار دیا، خورشید، میں کراچی سیر کرنے نہیں، اسے مارنے گیا تھا۔"

"سچ دادا، تم نے یہ بڑا زبردست کام کیا، میں بہت خوش ہوں۔"

"جانتے ہو، میں نے اسے کیسے مارا؟"

"میں کیا جانوں دادا، بتاؤ گے تو جانوں گا نا۔" خورشید نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بیٹا، وہ سانپ تھا۔ جانے اس نے کتنی معصوم عورتوں کو ڈسا تھا۔ جانے اس نے کتنے لوگوں کا اپنی باتوں سے دل دکھایا تھا، اپنے ہاتھوں سے آزار پہنچایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مرا تو سب خوش ہوئے۔ اس کے لیے کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھا، کسی کے چہرے پر دکھ نہ تھا۔ ایسی بدنصیب موت اللہ کسی کو نہ دے۔ بیٹا، تجھے معلوم ہے ناں زہر، زہر کو مارتا ہے۔ لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے۔ وہ سانپ تھا، اسے سانپ کے ذریعے ہی ملایا جا سکتا تھا، سو میں نے اسے سانپ کے ذریعے مار دیا۔" خدا بخش نے یہ کہہ کر بغور خورشید کو دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں دادا۔"

"اوہ، ارے اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آئی، میں نے اسے سانپ سے ڈسوا دیا۔"

"پر آپ کے پاس سانپ کہاں سے آیا؟"

"تجھے وہ محمود سپیرا یاد نہیں، وہ جو گلی بستی میں مسجد کے پاس رہتا تھا۔"

"ہاں دادا یاد ہے۔"

"میں سیدھا اس کے پاس گیا، اس کے ہاتھ پر منہ مانگے پیسے رکھے، اس نے لکڑی کے صندوقچے میں وہ زہریلا سانپ بند کر کے میرے حوالے کر دیا۔"

"پھر دادا، تم نے اسے کیسے کٹوایا؟"

جواب میں خدا بخش نے ساری تفصیل بتائی کہ کیسے اس نے اس کے دل میں لالچ پیدا کر کے اسے اپنے جال میں پھنسایا۔ پھر وہ کس طرح مرا، اور کس طرح اس کی لاش سارا دن گھر میں پڑی باعث عبرت بنی رہی۔ تفصیل بتا بتا کر خدا بخش بڑی دیر تک کانوں کو ہاتھ لگاتا رہا۔ "اللہ، میری توبہ۔"

"دادا، تم نے ایک موذی کو مارا، بڑا ثواب کا کام کیا، یہ کام اگر میرے ہاتھوں انجام پاتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ خیر تم نے کر دیا، خوشی مجھے اب بھی ہے، بس دادا، اب تم جلدی سے اچھے ہو جاؤ، پھر اس خوشی میں وادی کی سیر کو چلیں گے۔ بہت دن ہو گئے ادھر گئے ہوئے۔ خوب نہائیں گے، خوب مستی دھمال کریں گے، کیوں دادا ٹھیک ہے نا۔"

"بالکل بیٹا، ضرور چلیں گے۔" خدا بخش نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔ "بیٹا، ایک بات کہوں۔"

"جی، دادا، کہو۔"

"آج میں بہت مطمئن ہوں، ایک طرف میں نے تیری ماں کا انتقام لے لیا اور دوسری طرف مجھے یہ اطمینان ہے کہ تو اس وقت اچھے ہاتھوں میں ہے۔ نادرہ بیٹی کو تجھ سے بہت محبت ہے۔ اب اگر میری آنکھ بند بھی ہو جائے تو تو خود کو تنہا محسوس نہ کرے گا۔"

یہ سن کر خورشید نے درمیان میں کچھ مداخلت کرنے کی کوشش کی۔ اسے خدا بخش کی یہ بات اچھی نہ لگی لیکن اس نے اسے بولنے نہ دیا۔ اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹا، تم خاموش رہو، میرے پاس وقت کم ہے، جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنتے رہو۔ بیٹا، نادرہ بہت اچھی عورت ہے، اس کا ہمیشہ خیال رکھنا، اسے ایکٹریس کبھی نہ سمجھنا، کسی عورت کی روح ایکٹریس نہیں ہوتی، جو لوگ عورت کی عزت نہیں کرتے وہ کبھی باعزت نہیں ہو سکتے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ اب آؤ، میرے گلے لگ جاؤ، اب کے بچھڑے جانے کب ملیں، ملیں کہ نہ ملیں۔"

خدا بخش نے خورشید کو اپنے سینے پر لٹا لیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

بس اسی اثنا میں وہ لمحہ آ پہنچا جب روحوں کو دنیا سے اٹھا لیا جاتا ہے۔

خدا بخش کی روح کو بھی اٹھا لیا گیا۔ اس کا ہاتھ خورشید کے سر سے ڈھلک گیا۔ خورشید نے سر اٹھایا تو خدا بخش کا تھوڑا سا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

خورشید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ "دادا، دادا!"

لیکن دادا تو اب وہاں جا چکا تھا، جہاں سے کسی کی خبر نہیں آتی۔

جب نادرہ کو خبر ہوئی تو وہ مہمانوں کو چھوڑ کر بھاگی ہوئی خدا بخش کے کمرے میں آئی۔ اس نے روتے ہوئے خورشید کو خدا بخش کی لاش سے الگ کیا۔ خورشید ہوش میں آؤ، ابا کو سکون سے سونے دو۔"

نادرہ نے خدا بخش کے بے روح جسم پر ایک چادر ڈال دی۔ پھر خورشید کے آنسو اپنے دوپٹے سے صاف کیے۔ اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھا اور خورشید کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آئی۔

"باجی، کیا دادا مر گئے؟"

Pdf by Aswad Raza

"ہاں، خورشید وہ اب اس دُنیا میں نہیں رہے۔"

"اس دُنیا میں وہ مجھے تنہا چھوڑ گئے۔"

"نہیں خورشید تم تنہا نہیں ہو، میں ہوں تمہارے ساتھ۔"

جب خالد کو خدا بخش کی موت کا پتا چلا تو اس نے خوش ہو کر کہا۔ "چلو پاپ کٹا، اب وہ چھوکرا رہ گیا ہے۔ وہ بھی جائے تو جان چھٹے۔"

لیکن خورشید اس گھر میں جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔

نادرہ نے بالوں میں برش پھیرتے پھیرتے برش پر نگاہ کی تو اُسے وہاں آٹھ دس کالے بالوں میں ایک سفید بال نظر آیا۔ اُس نے اس سفید بال کو برش سے کھینچ لیا اور اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے آئینے کے نزدیک ہو کر اپنے بالوں کو غور سے دیکھا تب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے بالوں میں یہ اکلوتا چاندی کا تار نہیں تھا جو ٹوٹ کر برش میں آ گیا تھا، بلکہ ایسے کئی تار اس کے سر میں چمک رہے تھے۔

اب وہ چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ اگر اس کے سر میں سفیدی جھلکنے لگی تھی تو یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ عمر کا تقاضا تھا۔ سفید ہوتے بال اُسے اس بات کا اشارہ کر رہے تھے کہ حُسن کا سورج اب ڈھلنے کو ہے۔ خیر نادرہ کو اپنے ڈھلتے حُسن کی کوئی خاص پروا بھی نہ تھی۔

وہ فلم انڈسٹری کو کب کی خیر باد کہہ چکی تھی اور فلم انڈسٹری کو اس نے اس وقت چھوڑا تھا جب کوئی اُسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اپنے عروج پر تھی۔ اور اسی عروج کے زمانے میں یہ مشکل فیصلہ کیا کہ وہ شہرت اور دولت دونوں چھوڑ دے گی۔ خالد نے بہت زور لگایا کہ وہ اپنا فیصلہ واپس لے لے لیکن نادرہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"اب چھوڑ دیا، سو چھوڑ دیا۔" اُس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"نادرہ تم غلطی پر ہو بعد میں پچھتاؤ گی۔"

"اگر میں نے فیصلہ بدل لیا تو پچھتاؤں گی۔"

"اچھا چلو یوں کر لو، سال میں صرف ایک فلم سائن کر لیا کرو۔"

"بات ایک یا دو فلموں میں کام کرنے کی نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ اب میں کسی فلم اسٹوڈیو کا دروازہ نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں نے بہت شہرت پائی، بہت دولت پائی۔ اب مجھے کسی چیز کی ہوس نہیں۔"

"اس مسئلے پر تم نے خورشید سے بات کی؟"

"ارے یہ تمہیں آج خورشید کیسے یاد آ گیا۔ اس سے تو تم نے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ تم شاید اُسے آخری حربے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہو، لیکن تمہیں اتنا بتا دوں کہ خورشید نے کبھی میرے ایکٹریس ہونے پر اعتراض نہیں کیا لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ میرے اس فیصلے سے خوش ہو گا۔"

نادرہ نے یہ ایک مشکل فیصلہ کیا تھا اور وہ جانتی بھی تھی کہ وہ ایک مشکل فیصلہ کر رہی ہے۔ ترغیبات اس کے قدم ڈگمگائیں گی لیکن اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے فیصلے پر قائم رہے گی۔

نادرہ نے مختلف کاروبار میں اپنا پیسہ لگا دیا۔ دو کوٹھیاں خرید لیں۔ ایک فارم بنا لیا۔ کچھ مستحکم کمپنیوں کے حصص خرید لیے اور ان تمام کاروبار کا خورشید کو نگراں مقرر کر دیا۔

خورشید نے گریجویشن کر لیا تھا اس نے بڑا اچھا قد کاٹھ نکالا تھا۔ وہ ذہین تو تھا ہی اتنا ہی خوبصورت بھی تھا۔ کئی ہدایت کاروں نے اُسے فلم میں بطور ہیرو کام کرنے کی پیشکش بھی کی تھی، جسے اس نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔ اداکاری کی طرف اس کا قطعاً رجحان نہ تھا بلکہ وہ فلم انڈسٹری کے ماحول اور وہاں کام کرنے والوں سے چڑتا تھا۔ وہ نادرہ کے ساتھ ایک آدھ بار ہی اسٹوڈیو گیا تھا۔

نادرہ کو اب اُس کی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اُس نے اب تک بہت سی لڑکیاں دیکھ ڈالی تھیں لیکن کوئی من کو نہ بھائی تھی۔ اُسے خورشید کے لیے ایک انتہائی خوبصورت اور ذہین لڑکی کی تلاش تھی۔ خوبصورت لڑکیاں اُس نے کئی دیکھی تھیں لیکن ذہانت کے بغیر۔ خوبصورتی اور ذہانت ویسے بھی دو متضاد چیزیں ہیں۔

پھر ایک دن بیٹھے بیٹھے اُسے خیال آیا کہ وہ دُنیا بھر میں لڑکیاں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ ہو سکتا ہے خورشید نے کہیں کوئی لڑکی دیکھ رکھی ہو، اُس سے بھی بات کر لینی چاہیے۔ یہی سوچ کر اُس نے ایک دن خورشید سے بات کی۔

"خورشید مٹھو!" نادرہ نے بات چھیڑی۔

"جی، باجی؟" اُس نے سوالیہ نظروں سے نادرہ کو دیکھا۔

"میں آج کل لڑکیاں دیکھ رہی ہوں، لڑکیاں دیکھتے دیکھتے خیال آیا کہ پہلے تم سے تو پوچھ لوں، تم سے تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔" نادرہ نے کہا۔

"مجھ سے کیا پوچھنا ہے باجی؟" یہ سوال بھی تھا، اور جواب بھی۔

"بھئی، بعد میں شکایت نہ کرنا۔"

"شکایت کیسی باجی؟"

"کسی سے وعدے وغیرہ تو نہیں کر رکھے، صاف بتا دو۔" نادرہ نے اُسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"صاف بتا دوں؟"

"ہاں، بالکل۔ کوئی ہے کیا؟"

"نہیں، باجی، کوئی نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔" خورشید سنجیدگی سے بولا۔

"وہ کیوں؟"

"شادی کسی عذاب سے کم نہیں، میری ماں نے شادی کی تھی تو اُسے کیا ملا۔ میں اپنی ماں کا دُکھ بھرا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ پھر آپ نے شادی کی تو آپ کو کیا ملا۔ خالد صاحب نے آپ کو کیا دے دیا؟"

"تم میری بات نہ کرو، میں نے تو صبر کر لیا ہے۔"

"آخر ایسی کیا مجبوری ہے، آپ خالد صاحب سے اتنا کیوں ڈرتی ہیں۔ میں نے بارہا آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔ آپ کے آنسو دیکھ کر مجھے ہمیشہ اپنی ماں یاد آتی ہے۔ دونوں کو ظالم شوہر ملے۔"

"میں تم سے یہ پوچھ رہی تھی . . ."

"اب آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں بلکہ مجھے بتائیں۔"

"پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

"خالد صاحب سے آپ اتنا ڈرتی کیوں ہیں، اُن کی ہر جائز ناجائز بات خاموشی سے سُن لیتی ہیں۔ وہ آپ کو ہر وقت ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے ہیں اور آپ بڑی فرماں برداری سے اُن کی ڈانٹ سنتی رہتی ہیں۔ پوری زندگی انھوں نے آپ کو دیا کیا ہے۔ سوائے دُکھوں کے۔ آپ کے پیسے پر انھوں نے ٹھاٹ کی زندگی گزاری اور اب بھی گزار رہے ہیں۔ اس کے باوجود اُن کی پیشانی کبھی بھی تیوری کی شکنوں سے خالی نہ دیکھی۔"

"خورشید، تم نہیں جانتے خالد کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔"

"میں نہیں جانتا تو مجھے بتا دیجیے۔ آخر انھوں نے آپ پر ایسا کیا احسان کر دیا ہے کہ آپ اُن کی زرخرید لونڈی بن گئی ہیں۔"

"چلو چھوڑو، پھر بتا دوں گی، اس وقت تم اپنی بات کرو۔"

"چلیے، میں اپنی بات کرتا ہوں۔ مجھ پر آپ کے واقعی بہت احسانات ہیں، اتنے کہ میں چھ جنم بھی لوں اور آپ کے احسانات اُتارنے کی کوشش کروں تو بھی نہ اُتریں۔ ایک مزدور کے بیٹے کو آپ نے شہزادہ بنا دیا۔ مجھے آپ نے وہ دیا جو میں محض خواب میں دیکھ سکتا تھا۔ میں . . ."

نادرہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خبردار! آگے جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔ میں تم سے یہ بات کرنے کو نہیں کہہ رہی تھی، میں تم سے تمہاری شادی کی بات کرنا چاہتی تھی۔"

"میں جانتا ہوں، آپ مجھ سے کیا سُننا چاہ رہی تھیں لیکن میں جو سُننا چاہتا ہوں، وہ آپ مجھے کیوں نہیں سناتیں۔ وہ راز مجھے کیوں نہیں بتاتیں جس نے خالد صاحب جیسے نکھٹو آدمی کو اتنا نڈر بنا دیا ہے۔ وہ گھر میں ہوتے ہیں تو صرف احکامات صادر کرتے رہتے ہیں۔"

"اچھا، ٹھیک ہے، میں تمہیں بتاتی ہوں۔" نادرہ نے کہا۔ "تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"جی ہاں، میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں، اتنا عرصہ آپ کے ساتھ رہ کر بھی میں نہ جانوں گا کہ آپ کون ہیں، آپ ایک مُحسن اخلاق کا مجسمہ ہیں، حُسن کی دیوی ہیں۔"

"نہیں خورشید، تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں کون ہوں؟ میرا تعلق ایک انتہائی غریب گھرانے سے ہے۔ بس میرا بھی ایسا ہی گھرانہ تھا جیسا تمہارا تھا یا ہو سکتا ہے اُس سے کچھ بہتر رہا ہو۔ میرے والد پنواڑی تھے۔ اُن کی ایک چھوٹی سی پان کی دُکان تھی۔ ہم چھ بہن بھائی تھے۔ میں اُن سب میں بڑی تھی۔ میرے والد پورے کنبے کے واحد کفیل تھے۔ وہ رات کے بارہ ایک بجے گھر لوٹتے تھے۔ بڑے محنتی انسان تھے وہ۔ گھر آ کر وہ رات کا کھانا کھاتے، پھر کام کرنے بیٹھ جاتے۔ کبھی چھالیا کتر رہے ہیں کبھی پانوں کے ڈنٹھل توڑ رہے ہیں کبھی مسالحہ تیار کر رہے ہیں۔ اسی طرح کام کرتے دو ڈھائی بج جاتے۔ پھر صبح ہی اُٹھ جاتے۔ ناشتا کر کے دُکان کی راہ لیتے۔ میری امی کا انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں نے سنبھال رکھا تھا۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ میرے والد بھی فلموں کے بڑے عاشق تھے۔ اس لیے وہ ہر چھٹی والے دن فلم دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ ہم بچے بھی اُن کے پیچھے پڑ جاتے تو وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ میرے والد پنواڑی ضرور تھے۔ زیادہ تعلیم بھی نہ تھی۔ پھر بھی بڑے روشن خیال تھے۔ وہ مجھے پڑھانا چاہتے تھے لیکن میں میٹرک سے زیادہ نہ پڑھ سکی۔ پھر میری زندگی میں راشد آیا۔ وہ ہماری گلی میں ہی رہتا تھا۔ اُس کے والد ایک سرکاری محکمے میں کلرک تھے۔ راشد پڑھ رہا تھا۔ شاید وہ ان دنوں انٹر میں تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا یا ہو سکتا ہے سال دو سال بڑا ہو۔ اُس نے میرے گرد جال پھیلایا۔ میں اُس کے جال میں پھنس گئی۔ پھر میں اُس کے اصرار کرنے پر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ چلتے ہوئے میں نے وہ زیورات جو میرے والد نے میرے لیے بنوائے تھے اور گھر میں جو نقدی تھی، ساتھ لے لی۔ منزل کا تعین کیے بغیر ہم ٹرین میں سوار ہو گئے۔ میں نے گھر سے جو سمیٹا تھا، وہ راشد کے حوالے کر دیا۔ راشد کی محبت میں کھوٹ تھا جسے میں نہ پہچان سکی۔ مجھے اُس وقت ہوش آیا جب میں ٹرین میں تنہا رہ گئی۔ راشد ایک اسٹیشن پر کچھ کھانے پینے کی اشیاء لینے اُترا تھا۔ گاڑی چل پڑی مگر وہ ڈبے میں نہ آیا۔ میں نے سوچا پیچھے کسی ڈبے میں چڑھ گیا ہو گا، آ جائے گا۔ مگر وہ نہ آیا۔ اُس نے میرے پاس کچھ نہ چھوڑا تھا۔ بس میری آنکھوں میں آنسو رہ گئے تھے جو بھر بھر کر آ رہے تھے۔ پھر کچھ غنڈوں نے مجھے تنہا دیکھ کر . . . پریشان کرنے کی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے اور مجھے ٹرین سے اُتارنے جانا چاہتے تھے۔ اُس وقت اگر خالد سامنے نہ

UrduPhoto.com

Pdf by Aswad Raza

آتے تو شاید وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتے۔ اور آج میں تمہارے سامنے نہ ہوتی۔ کس طوائف کے کوٹھے پر کب کی مرکھپ چکی ہوتی۔ خالد نے مجھے نہ صرف اُن غنڈوں سے نجات دلائی بلکہ سہارا بھی دیا۔ میں گھر سے کشتیاں جلا کر نکلی تھی لہٰذا واپسی کا کوئی سوال نہ تھا۔ خالد اُس وقت بمبئی جا رہے تھے۔ بمبئی میں اُن کا گھر تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ اُن کے ماموں آغا جنید ہدایت کار تھے۔ خالد نے مجھے اُن سے متعارف کرایا اور اس طرح میں فلمی دُنیا میں آ گئی۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہم لوگ یہاں آ گئے۔ یہاں آ کر میں نے بہت جلد فلم انڈسٹری میں اپنا مقام بنا لیا۔ خالد نے یہاں آ کر دو تین فلمیں بنائیں جو سب کی سب ناکام رہیں۔ فلمسازی سے بددل ہو کر انھوں نے چار پانچ فلموں کے اسکرپٹ لکھے، وہ بھی نہ چل سکے۔ اپنی ناکامی کی انھیں اتنی فکر بھی نہ تھی۔ میں جو چل رہی تھی۔ پھر میں اُن کے لیے سونے کی چڑیا بن گئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، ان تمام حالات سے تم اچھی طرح آگاہ ہو۔ تم جس راز سے آگاہ نہ تھے، وہ آج میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ میں خالد کی تمام زیادتیوں کے باوجود کیوں اُن کے سامنے گردن ڈالے رہتی ہوں۔" نادرہ نے خورشید کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

"باجی، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، ایک ذرا سے احسان کے بدلے آپ نے اُن کی زندگی کو جہنم کر دیا۔" خورشید نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"نہیں، بات کیوں نہیں ہوئی، بات تو ہے، کوئی اگر مانے تو بہت بڑی بات ہے، نہ مانے تو کچھ بھی نہیں۔ میں اُن کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتی اور یہی وجہ ہے کہ مجھے ان کی زیادتیوں پر کبھی کبھی بہت غصہ آتا ہے لیکن میں خاموشی سے پی جاتی ہوں۔"

"باجی، آپ بہت گریٹ ہیں، بہت عظیم عورت ہیں۔" خورشید نے نادرہ کو احترام کے انداز میں دیکھا۔

وہ آئینۂ ایام میں خواب بھری آنکھوں سے ماضی کو دیکھ رہی تھی۔ یہ اُسے کل کی بات لگتی تھی جب وہ خورشید کو اپنے گھر لے آئی تھی۔ کل کا بچہ آج بھرپور جوان بن چکا تھا۔ خالد اُسے دُکھ پہنچاتا تو خورشید مرہم بن کر سامنے آ جاتا۔ خورشید نے اُسے بہت احترام اور بہت پیار دیا تھا۔ فلموں سے ریٹائرمنٹ کی بات بھی اُسے کل ہی کی لگتی تھی۔ اس کی گھنی زلفیں جو کل تک نرم و ملائم اور ریشم جیسی تھیں، آج اُن میں وہ بات نہ رہی تھی، وہ روکھی پھیکی ہو گئی تھیں، اُن کا ریشم ختم ہو گیا، چمک اُڑ گئی تھی اور سیاہی اب چاندی کے تاروں میں تبدیل ہونے لگی تھی۔

وہ ہاتھ میں برش پکڑے، اُس میں لگے سفید بال کو گھور رہی تھی کہ خالد کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مسکراتا ہوا، اُس کے پیچھے، نزدیک آ کھڑا ہوا۔ نادرہ نے اُس کا عکس آئینے میں دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک دیکھ کر سمجھ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ اُس نے جواباً صرف مسکرا کر اُسے دیکھا۔

"ڈارلنگ، آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

نادرہ کو ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کے مُنہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ اُس نے اپنی سُبکی سی محسوس کی۔ اس لیے نہیں کہ خالد نے اُس کی تعریف کی تھی۔ اپنی تعریف کون سُننا نہیں چاہتا۔ لیکن سچی تعریف اور خوشامد میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خالد کے لہجے میں قطعاً خلوص نہ تھا اور اسی بات نے اس تعریف کو تھپڑ بنا دیا تھا۔

بظاہر اُس نے اس بات کا پھر بھی بُرا نہ مانا۔ اُس نے بس اتنا کیا کہ خالد کے عکس سے اپنی نظریں ہٹا لیں اور بے نیازی سے اپنے بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

"کچھ ناراض ہو؟" خالد کو آج بہت پیار آ رہا تھا۔

"فضول باتوں میں اپنا وقت برباد مت کرو، مقصد بیان کرو۔" اُس نے کہنا چاہا، مگر کہہ نہ سکی۔ صرف اتنا کہا: "میں تو ناراض نہیں، میں بھلا کس بات پر ناراض ہوتی؟"

"تم نے آج کا اخبار دیکھا؟" خالد نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

"نہیں تو۔" وہ سنجیدگی سے بولی: "کوئی خاص بات؟"

"ہاں، خاص بات ہے، تبھی تو پوچھ رہا ہوں۔"

"کوئی خبر ہے کیا؟"

"نہیں، خبر تو کوئی نہیں، ایک اشتہار ضرور ہے۔" خالد نے خوش ہو کر کہا۔

"اشتہار؟" نادرہ نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا: "کیا اشتہار ہے؟" وہ سمجھ نہ سکی۔

"بھئی، میں نے ایک فلم اناؤنس کی ہے، اُس کا اشتہار ہے، یہ دیکھو۔" خالد کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اُس نے اُسے کھول کر نادرہ کے سامنے کیا۔

یہ آدھے صفحے کا اشتہار تھا۔ فلم کا نام تھا "آکاش"۔ فلمساز، ہدایت کار اور مصنف کی حیثیت سے خالد لاثانی کا نام تھا۔ ہیرو اور ہیروئن کریم اور شبانہ تھے۔ موسیقی دادا بھائی کی تھی۔

اچھا تو یہ بات تھی۔ اُس نے نادرہ سے پوچھے بغیر بالا ہی بالا فلم کا اشتہار دے دیا تھا اور وہ اب اُس کے پاس سرمایہ حاصل کرنے آیا تھا۔ اسی لیے صبح ہی صبح وہ اُسے پیاری لگ رہی تھی۔

نادرہ نے اشتہار دیکھ کر کوئی رائے نہ دی۔ خاموشی سے اخبار اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کیسا ہے اشتہار، تمہیں پسند آیا؟" خالد نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے، اچھا ہے۔" نادرہ نے بے نیازی سے کہا۔

"نادرہ، مجھے تم سے ایک بات کہنا تھی۔"

"جی، فرمائیں۔" نادرہ جانتی تھی، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"مجھے فلم پروڈیوس کرنے کے لیے رقم درکار ہے۔" آخر حرفِ مدعا لوگ زباں پر آیا۔

"خالد، میری بات مانو تو اب فلمسازی کے چکر میں مت پڑو، یہ محض گھاٹے کا سودا ہے۔"

"نہیں، اس فلم سے مجھے بہت اُمیدیں وابستہ ہیں۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ کریم کو سنائی تو وہ پھڑک اُٹھا۔ شبانہ کو بھی بہت پسند آئی، تم بھی سُنو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ میری یہ فلم ضرور کامیاب ہو گی۔ میں نے ٹوکن منی دے کر کریم اور شبانہ کو سائن کر لیا۔ اُن سے تاریخیں بھی لے لی ہیں۔ بس فلم کو سیٹ پر لے جانے کے لیے رقم درکار ہے۔ پہلا سیٹ ختم کرتے ہی اِنشاءاللہ فلم فروخت ہو جائے گی۔ پھر میں تمہاری رقم تمہیں لوٹا دوں گا۔ پھر تو تھیم کا پیسہ استعمال ہوگا۔" خالد نے نادرہ کو جھانسا دینے کی کوشش کی۔

نادرہ بھلا جھانسے میں کب آنے والی تھی۔ وہ تو پہلے ہی زخم کھائے ہوئے تھی۔ وہ خالد کو اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس کی صلاحیتوں سے بھی واقف تھی، اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پوری فلم مکمل کرنے کے بعد بھی کوئی تقسیم کار اُسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ایک ناکام آدمی جس نے پوری زندگی محض باتیں کر کے گزار دی ہو، اب اس عمر میں بھلا کیا کام کر کے دکھا سکتا تھا۔

نادرہ کب کی فلم انڈسٹری چھوڑ چکی تھی۔ اُسے اب نہ فلموں سے لگاؤ تھا، نہ فلم انڈسٹری سے۔ اُس نے کہا: "خالد، میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

نادرہ نے خالد کو کبھی کسی بات کے لیے انکار نہ کیا تھا۔ جیسا وہ کہتا تھا، وہ ماں لیتی تھی لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے اور آج وہ حد ختم ہو گئی تھی۔

خالد یہ بات سُن کر غصے میں آ گیا: "تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں، تم جھوٹ بولتی ہو؟"

"میں جھوٹ نہیں بول رہی، سچ کہہ رہی ہوں، میرے پاس نقد ایک پیسہ بھی نہیں، جو کچھ ہے وہ سب کاروبار میں لگا ہوا ہے۔"

"تو کاروبار سے نکال لو، فلمسازی بھی تو ایک کاروبار ہے۔"

"ہاں، کاروبار ضرور ہے لیکن بہت رسکی۔ میں نے اس کاروبار میں اچھے اچھوں کو ڈوبتے دیکھا ہے۔"

"ڈوبنے والے اپنی حماقت سے ڈوبتے ہیں۔" وہ بحث پر اُتر آیا۔

"تم کچھ بھی کہو، کتنے ہی دلائل دو لیکن میں نے تمہیں جو جواب دے دیا ہے وہ آخری ہے۔" نادرہ نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

یہ سُن کر خالد کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ خالد کچھ کہتا، خورشید کمرے میں آ گیا۔ پھر وہ دونوں کو کمرے میں دیکھ کر ذرا جھجکا اور واپس جانے لگا۔

"ٹھہرو خورشید، ہم یہاں کوئی ذاتی نوعیت کی بات نہیں کر رہے، تم اندر آ سکتے ہو۔" نادرہ نے اُسے روکا۔

"بس باجی میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ آپ تیار ہوئی ہیں یا نہیں، آج غلام پر چلنا ہے۔"

"ہاں، میں تیار ہوں، بس بال باندھنے میں مجھے پانچ منٹ مزید لگیں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، میں جب تک گاڑی نکالتا ہوں، آپ باہر آ جائیے۔"

"اوکے۔" نادرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خورشید کے باہر جانے کے بعد خالد بولا: "اسے تم نے تمیز نہیں سکھائی؟"

"کیا ہوا؟ تمہیں تو اُس نے کچھ نہیں کہا۔"

"اسے اپنے سے بڑوں کو سلام کرنا نہیں آتا۔"

"جلدی میں تھا، شاید اس لیے تمہیں سلام کرنا بھول گیا۔" نادرہ نے ایسے ہی بات ٹالنے کے لیے ایک بات کہہ دی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خورشید نے اُسے جان بوجھ کر سلام نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی وہ اُسے سلام کہاں کرتا تھا۔ اُسے خالد سے نفرت تھی اور یہ نفرت اس رویے کی وجہ سے تھی جسے خالد نے نادرہ کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ خالد نے پوری زندگی خورشید سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ وہ اُسے ایک "چھوکرے" سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہ تھا۔ اُسے گھر کا ملازم سمجھتا تھا۔

"تم نے اُسے سر پر چڑھا رکھا ہے، کسی دن یہ میرے ہاتھوں پٹے گا۔" کہیں کا غصہ کہیں نکلا۔

"اچھا، فی الحال تو میں جا رہی ہوں، اب شام کو بات ہوگی۔" نادرہ نے اپنا پرس سنبھالتے ہوئے کہا۔

"رقم کے متعلق تم شام تک سوچ لینا، پیسے مجھے ہر قیمت پر چاہئیں۔ مجھے آرٹسٹوں کو ایڈوانس دینا ہے۔" یہ کہہ کر وہ نادرہ سے پہلے کمرے سے نکل گیا۔

نادرہ نے اُسے جاتے ہوئے غصے سے دیکھا اور دل ہی دل میں بولی: "میں نے سوچ لیا ہے، تمہیں ایک پائی بھی نہ دوں گی، دیکھتی ہوں، تم میرا کیا بگاڑ لیتے ہو۔"

خورشید گاڑی میں بیٹھا نادرہ کا انتظار کر رہا تھا۔ پانچ منٹ کے بعد وہ آئی تو کچھ خاموش خاموش سی تھی۔ وہ چپ چاپ گاڑی

Pdf by Aswad Raza

میں بیٹھ گئی۔ خورشید نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بولا: "باجی، خیریت تو ہے؟"

"وہ تمہاری شکایت کر رہے تھے۔" نادرہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیا فرما رہے تھے؟"

"تم نے انہیں سلام نہیں کیا، آخر وہ تم سے عمر میں بڑے ہیں۔"

"باجی میں انسانوں کو سلام کرتا ہوں۔" خورشید نے ڈوبتے دل سے جملہ کسا۔

"زیادہ بکواس مت کرو، وہ تمہارے دولہا بھائی ہیں۔"

"بس یہی تو ساری مصیبت ہے کہ وہ میرے دولہا بھائی ہیں، آپ نے بھی باجی کیسا شوہر منتخب کیا۔ وہ تو عجائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔ ویسے ایک بات آپ کو بتا دوں اگر ایسا ہو گیا تو کوئی مغفت بھی انہیں دیکھنے نہیں آئے گا۔"

"تم نے آج کا اخبار دیکھا؟" نادرہ نے خورشید کی بکواس پر زیادہ توجہ نہ دی۔

"کیوں؟" خورشید نے اُسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ "کیا اس میں مونگ پھلی کھاتے ہوئے دولہا بھائی کی تصویر چھپی ہے؟"

"ایسا ہوتا تو وہ بھی برداشت کر لیتی مگر انہوں نے تو کچھ اور ہی کر دکھایا ہے۔" نادرہ کی سنجیدگی برقرار رہی۔

"کیا ہوا باجی؟ آپ تو سنجیدہ ہیں؟"

"انہوں نے فلم اناؤنس کر دی ہے، اس کا اشتہار چھپا ہے، مجھ سے فلمسازی کے لیے رقم مانگ رہے تھے، اسی لیے آئے تھے میرے کمرے میں۔" نادرہ نے بتایا۔

"آپ نے فوراً ہی بھر لی ہوگی۔" خورشید نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں۔" نادرہ نے گہرا سانس لیا۔ "میں نے زندگی میں ان کی اتنی ہاں میں ہاں ملائی ہے کہ اب مجھے اپنی ہر ہاں زہر لگنے لگی ہے۔ میں نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا۔"

"آپ کا انکار سن کر تو وہ چراغ پا ہو گئے ہوں گے۔"

"انہوں نے مجھے شام تک مزید سوچنے کا موقع دیا ہے۔"

"پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"میں اپنی رقم تباہ نہیں کرنا چاہتی، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ انہیں ایک پائی بھی نہیں دوں گی۔"

"وہ جھگڑا کریں گے آپ سے، آپ رقم دینے پر مجبور ہو جائیں گی۔"

"کریں جھگڑا۔ دیکھتی ہوں، وہ کہاں تک جھگڑا کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ دو چار دن کے لیے گھر سے روٹھ کر چلے جائیں گے۔ بس یہی ہوگا نا۔"

شام کو جب وہ گھر لوٹی تو اُس کے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔

"ہاں، تم نے کیا سوچا؟" خالد نے اُس کے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟" نادرہ نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"رقم کے بارے میں۔"

"وہ تو میں نے تمہیں صبح ہی بتا دیا تھا کہ فضول کاموں کے لیے میرے پاس رقم نہیں ہے۔"

"کتیا۔" اُس کا جواب سن کر وہ اتنے زور سے دہاڑا کہ خورشید کے کمرے تک اُس کی آواز گئی۔ خورشید فوراً اپنے کمرے سے نکل آیا۔

خالد نے آگے بڑھ کر نادرہ کے منہ پر تھپڑ مارا۔ "تو کیا سمجھتی ہے، اگر تو مجھے رقم نہیں دے گی تو میں فلم بنا نہیں سکوں گا، میں تجھے فلم بنا کر دکھاؤں گا۔ اب تو میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی ہے، میں تجھے طلاق دے دوں گا۔"

خورشید دروازے پر کھڑا یہ سب سن رہا تھا۔ نادرہ کی حالت غیر ہو گئی تھی، چہرہ ایک دم گھلے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا تھا، وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے خالد کو دیکھ رہی تھی۔

خالد نے زندگی میں بہت من مانی کی تھی، اُسے بہت دکھ پہنچائے تھے لیکن کبھی اُس پر ہاتھ نہ اُٹھایا تھا لیکن آج وہ نادرہ کا انکار سن کر غصے میں اپنے سے باہر ہو گیا۔۔۔ بات طلاق تک پہنچ گئی۔

یہ سب دیکھ کر خورشید کو یوں محسوس ہوا جیسے آج پھر کسی بدتمیز بچے نے نادرہ کی گاڑی پر پتھر پھینکا ہو۔ عورت کی بے عزتی اُس سے بالکل برداشت نہ ہوتی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں جیسے کرنٹ دوڑنے لگا۔

اُس نے لپک کر خالد کو پکڑ لیا۔ اُس نے اُسے کتنا مارا، اس کا اُسے ہوش نہ رہا۔ بس اُس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ گھونسوں اور لاتوں کی بارش جاری تھی۔

خالد لحیم شحیم آدمی تھا لیکن شراب اور عیاشی نے اُسے اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ وہ جلد ہی زمین چاٹنے لگا۔

"کمینی عورت، کتیا۔ تو نے مجھے پٹوانے کے لیے اس سانڈ کو پالا تھا۔" وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "وہ وقت بھول گئی جب میں تجھے ایسے ہی سانڈوں سے بچا کر لایا تھا۔ ارے، میں نے تیرے لیے کیا نہیں کیا۔ میں نے تجھے کیا کچھ نہیں دیا۔ عزت ملی، شہرت ملی، پیسہ ملا۔ یہ سب میں نے دلوایا۔ آج میں بوڑھا ہو گیا ہوں، تو نے اس سانڈ کو پال لیا ہے۔ یاد رکھ، میں کمزور ضرور ہو گیا ہوں لیکن بے غیرت نہیں ہوا ہوں۔ میں تجھے آج ہی طلاق دوں گا۔"

یہ سن کر خورشید کو اور غصہ آ گیا۔ وہ پھرے ہوئے شیر کی طرح آگے بڑھا۔ نادرہ نے اُس کے تیور دیکھ لیے تھے، وہ جان گئی تھی کہ خورشید آج خالد کا ضرور خون کر دے گا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ اُس کے سامنے آ گئی اور تیز لہجے میں بولی: "خورشید، تمہیں میری قسم، اب ہاتھ نہ اُٹھانا، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"باجی، آپ میرے سامنے سے ہٹ جائیں، آپ کی انہی کمزوریوں نے اسے شیر کر دیا۔ اس نکمے، آوارہ آدمی کی آج اتنی جرأت ہو گئی کہ اس نے آپ پر ہاتھ اُٹھا دیا اور اب طلاق کی دھمکی دے رہا ہے۔ یہی ڈراما میں نے بچپن میں اپنی ماں کے ساتھ دیکھا تھا۔ میرے سوتیلے باپ نے، اس کمینے نے، میری ماں کی ہڈیاں تک فروخت کر دیں اور ملبہ ہمارے گھر پھینک گیا مگر اس بے زبان نے اُف تک نہ کی۔ یہاں آپ کے پاس سب کچھ ہے، مگر حیثیت آپ کی بھی وہی ہے جو میری ماں کی تھی۔ یہ آدمی چاہتا ہے کہ آپ کی ہڈیاں تک بیچ ڈالے، مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

یہ سن کر خالد اُٹھ کھڑا ہوا اور طیش میں آ کر کہنے لگا: "ابے چڑی کے غلام، تو ہے کون؟ ہمارے درمیان بولنے والا۔ آج تو اس کا بڑا ہمدرد بن رہا ہے، اُس وقت تو کہاں تھا جب یہ اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی اور میں نے اسے غنڈوں سے بچایا تھا۔ اسے فلم انڈسٹری میں ایک مقام دلوایا اور آج یہ ذلیل عورت میرے احسانوں کا یہ بدلہ دے رہی ہے کہ مجھ جیسے نالی کے کیڑے کو، سانڈ بنا کر مجھ پر چھٹنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا، میں ابھی اس کو طلاق دوں گا۔"

"تو نے اپنے مطلب کے لیے اسے غنڈوں سے بچایا تھا۔ اس کی کمائی کھانے کے لیے تو نے اس کا عورت پن بچانے کے لیے غنڈوں سے نہیں چھڑایا تھا۔ اصل میں یہ تیری ضرورت ہے اور تو اس کی بیوی۔ طلاق تو نہیں، یہ تجھے دے گی۔ خیریت اسی میں ہے کہ تو خاموشی سے اس گھر سے چلا جائے۔"

نادرہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ برس رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اُس کا ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ایک طوفان تھا جو سر سے گزر رہا تھا۔

خالد بکتا جھکتا، دھمکیاں دیتا کمرے سے نکل گیا۔ خالد کے جانے کے بعد جیسے نادرہ کو ہوش آیا۔ وہ بولی: "خورشید تو نہیں جانتا کہ عورت کے لیے مرد کتنا بڑا سہارا ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں کوئی عورت تنہا زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہ جیسا بھی ہے، اچھا یا برا، یہ میری پناہ ہے، میری چھت ہے۔ آج تم میرے ساتھ ہو، کل جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو تم اپنی دنیا میں مگن ہو جاؤ گے، اُس وقت میں کس کی پناہ میں جاؤں گی، کون بنے گا میری چھت۔ میرا سہارا، میرا آسرا۔ بتاؤ۔"

خورشید نے کچھ دیر نادرہ کی اُڑی رنگت، پریشان چہرہ اور آنسوؤں میں بھیگی آنکھیں دیکھیں۔ پھر جیسے اُس کی آنکھوں میں خدا بخش جاگ اُٹھا۔ کہیں دور سے، بہت دور سے اُسے اپنے دادا کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"بیٹا، عورت نازک بیل کی طرح ہوتی ہے۔ اگر مضبوط سہارا مل جائے تو یہ خوب پھلتی پھولتی ہے۔ اگر شوہر نے زدہ دیوار پر چڑھا دو تو شورہ اُس کی رگوں کو چاٹ جاتا ہے۔"

خورشید نے بغور نادرہ کا چہرہ دیکھا۔ اُس کا سستا ہوا زردی مائل چہرہ اُس کی ماں سے کتنا ملتا جلتا ہو گیا تھا۔ اُس کی دہشت زدہ آنکھوں میں، اُس کی ماں کا تمام دکھ سمٹ آیا تھا۔

وہی دکھ جو صدیوں سے عورتوں کا مقدر بنا دیا گیا تھا۔

تب فیصلے کی گھڑی آ پہنچی۔ خورشید نے ایک لمحہ فیصلہ کیا۔ وہ نادرہ کے قریب آیا۔ اُس نے بڑے خلوص سے اُس کا ہاتھ تھاما اور دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

"میں تمہیں باجی ضرور کہتا ہوں مگر تم میری سگی بہن تو نہیں ہو۔ تم نے مجھے ماں کی تمنا بخشی ہے، مگر تم میری سگی ماں نہیں ہو۔ کیا ہوا اگر اللہ نے تمہیں مجھ سے کچھ برس پہلے پیدا کر دیا، میں

Pdf by Aswad Raza

تمہارا مرد بنوں گا۔ تمہیں وہ سچا پیار دوں گا جس کے لیے تم زندگی بھر ترستی رہی ہو۔ اب آئندہ تم میری پناہ میں ہوگی، میں تمہارا مضبوط سہارا بنوں گا۔ تم اب آنسو پونچھ دو اور ہر غم سے آزاد ہو جاؤ۔ اب اس چھت کے نیچے خوشیاں رقصاں ہوں گی۔ آؤ اٹھو۔"

نادرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھور رہی تھی۔ اُسے یہ سب سُن کر جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔

اور یہ سکتہ اُس پر کئی دن تک طاری رہا۔ جب اُسے خیال آتا تو وہ پوری جان سے کانپ جاتی۔

"ہائے، نہیں۔"

اُس کی روح پر لرزہ طاری ہو جاتا۔

اُس نے خورشید کو کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہ تھا۔ دیکھتی تو جب، جب اُس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال گونجا ہوتا۔ خورشید کو اُس نے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ اُسے اپنا چھوٹا بھائی سمجھا تھا۔

خورشید نے شادی کی پیشکش تو بڑے خلوص سے کر دی تھی لیکن بعد میں وہ اپنی اس پیشکش پر حیران رہ گیا۔ جو کچھ ہوا تھا بے اختیار ہوا تھا، اُس ظالم لمحے نے اُس کی سوچ یکلخت بدل دی تھی۔ نادرہ کو اگرچہ اُس نے کبھی ماں نہیں کہا تھا۔ باجی کہتا تھا، لیکن احترام اُسے ماؤں جیسا دیا تھا۔ اُس کے دل کے گوشے میں کہیں دور تک بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرتا۔

شادی کی پیشکش کرتے ہوئے اُسے احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ جو کچھ کہہ رہا ہے روح کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہے۔ پورے اعتماد اور خلوص سے کہہ رہا ہے۔

اُس نے جو کچھ کہا تھا، جذبات سے مغلوب ہو کر کہا تھا لیکن وہ جذباتی آدمی نہ تھا۔ اُس کا کہا ہوا، پانی پر لکیر نہ تھا، پتھر پر لکیر تھا۔

شادی کی پیشکش کرنے اور شادی کی پیشکش سننے کے بعد دونوں کے درمیان ایک حجاب سا آ گیا تھا۔ نادرہ تو خیر عورت تھی، اُس کے چہرے پر تو رنگ آنے ہی تھے لیکن خورشید بھی اُس سے کترایا پھر رہا تھا۔ دونوں کے درمیان ایک شیشے کی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ضرور تھے لیکن بات نہ کر پاتے تھے۔ نگاہیں جھک جاتی تھیں۔

نادرہ کئی دن تک سوچتی رہی۔

اب خورشید کے سوچنے کے لیے کچھ نہ رہ گیا تھا۔ وہ پیشکش کر چکا تھا اور اپنے فیصلے پر کسی چٹان کی طرح قائم تھا۔ اُسے اب نادرہ کے جواب کا انتظار تھا۔

نادرہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

زندگی میں بعض موڑ کتنے عجیب آتے ہیں کہ اُن کے بارے میں سوچ کر ہی آدمی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کان جھنجھنا اُٹھتے ہیں، لیکن ان موڑوں کو اس بات کی کہاں پروا ہوتی ہے کہ کس پر کیا بیتی۔ بعض فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی نہ چاہتے ہوئے بھی کر گزرتا ہے، تقدیر کا لکھا سمجھ کر۔

وہ شوبز نس کی عورت تھی۔ اگرچہ اُس نے فلم لائن سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لیکن ایک عالم اب بھی اُسے جانتا تھا۔ وہ سوچتی اپنے سے کہیں کم عمر کے لڑکے سے وہ بھی ایسا لڑکا جو اُس کے گھر میں پلا بڑھا، اُس کے بھائی اور بیٹوں کی طرح رہا، شادی کرے گی تو دُنیا کیا کہے گی، وہ دُنیا کو مُنہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے گی۔

یہ سوچ کر اُس کے اندر ایک تلخ عورت کروٹ لیتی جو سانپ کی طرح پھنکار بھر کر اُس سے پوچھتی، "تو کس دُنیا کی بات کرتی ہے۔ اس دُنیا نے تجھے دیا کیا ہے۔ دُنیا کبھی کسی کو کچھ نہیں دیتی۔ وہ تو بس لینا جانتی ہے، چھیننا جانتی ہے۔ تو اس دُنیا سے ڈرتی ہے۔ تو نے اگر خورشید کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تو یاد رکھ، یہ دُنیا تجھے کبھی خورشید کے ساتھ نہ رہنے دے گی۔ تجھ پر ایسے ایسے بہتان تراشے گی، ایسے ایسے رشتے جوڑے گی کہ تو انگاروں پر لوٹے گی اور ان انگاروں کو بجھانے کے لیے تیری آنکھ میں آنسو بھی نہ ہوگا۔ اس دُنیا کا یہی دستور ہے کہ مارتی بھی ہے اور رونے بھی نہیں دیتی۔ اس مُنہ بولے رشتے کی اہمیت ہی کیا ہے، جیسے پانی کا بلبلہ، اُبھرا اور ختم ہوا جیسے ہوا کا جھونکا، اِدھر آیا اور اُدھر گیا۔ رشتہ صرف خون کا ہوتا ہے اور تیرا اُس سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔"

پھر اس بات پر غور کر، اس معاشرے میں مرد کے بغیر رہا جا سکتا ہے بھلا۔ اکیلی عورت چاکلیٹ جیسی ہوتی ہے۔ ہر شخص اُسے اپنی زبان پر رکھنا چاہتا ہے۔ تو آخر کہاں کہاں بچے گی، کس کس سے مقابلہ کرے گی۔

تجھے زندگی میں ملا کیا۔ پوری زندگی تو نے آنسو بھری آنکھوں سے گزار دی۔ اب قسمت تجھ پر مہربان ہوئی ہے تو اُس سے فائدہ اُٹھا۔ زندگی کی کچھ گھڑیاں سکھ چین سے گزار لے۔

وہ کئی دن تک اپنے آپ سے لڑتی رہی۔ ایک کشمکش تھی۔ ایک جنگ تھی جو اُس کے اندر جاری تھی۔ خورشید اُس کے لیے ٹھنڈی چھاؤں تھا، وہ اُسے اپنے آپ سے جُدا نہیں کر سکتی تھی اور ساتھ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اُس کی پیشکش کو قبول کر لے۔

یہ زندگی بھی انسانوں کے ساتھ عجیب ڈراما کرتی ہے۔ ایسا کھیل کھیلتی ہے کہ آدمی ششدر رہ جاتا ہے۔ کچھ نہیں کر پاتا، زندگی کا کہا ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔

نادرہ نے بھی بالآخر زندگی کے اس عجیب فیصلے کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔